عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

طلوعِ اسلام

اکتوبر ۱۹۳۱ء

یادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا

ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

دہلی

دورِ جدید

مرتّب

آخوندزادہ حسین امام

بدل اشتراک

سالانہ: پانچ روپیہ - ششماہی: تین روپیے

فی پرچہ آٹھ آنے

جلد ۴ شمارہ ۱۰

رمضان المبارک ۱۳۶۰ھ مطابق اکتوبر ۱۹۴۱ء

فہرست مضامین

		صفحہ
لمعات	ادارہ	۱ - ۸
نجات کا قرآنی نظریہ	از جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز	۹ - ۳۷
زمانہ	جناب ڈاکٹر محمد اقبال علیہ الرحمۃ	۳۸ - ۳۹
قندیل جہانتاب		۴۰
رومی نطشے اور اقبال	جناب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب	۴۱ - ۵۱
نقد و نظر	ادارہ	۵۲ - ۵۴
تفسیر سورۂ فیل		۵۵ - ۶۴

لمعات

دنیا میں عقل کی تو ایک حد ہوتی ہے لیکن بے عقلی کی کوئی حد نہیں ہوتی یعنی کوئی نہ کوئی ایسا مقام آسکتا ہو جہاں پہنچ کر آپ کہدیں کہ اس سے آگے معاملہ حدِ عقل سے ماورا ہے لیکن آپ کہیں یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بے عقلی کی حد ہے۔ آپ جس حد کا بھی تعین کریں گے کوئی نہ کوئی ایسا نکل آئے گا جسکی بوالعجیاں آپکی اس حدود بندی کو چیلنج دیدیں چنانچہ اس میدان میں حدود فراموشی کا یہ نیا ریکارڈ ہمارے اس بھائی کی طرف سے قائم ہوا ہے جسے ہم ایک عرصہ سے "نادان دوست" کہتے چلے آرہے تھے دنیا میں قومیں اس وقت پنپتی ہیں جب ان کے ارباب حل و عقد کی جماعت ایسے افراد پر مشتمل ہو جن کے سینے میں پرخلوص دل، اور سر میں فراست آمیز دماغ ہو ہمارے ہاں مصیبت یہ ہے کہ چند مستثنیات کو چھوڑ کر جہاں تدبر و فراست ہو، وہاں خلوص و ایقان نہیں اور جہاں خلوص و ایمان ہے وہاں تدبر و فراست نہیں نتیجہ یہ کہ کبھی اول الذکر گروہ کی منافقانہ رہ یا بازیوں کا رونا قوم کے سامنے ہوتا ہے اور کبھی ثانی الذکر کی ناعاقبت اندیشیوں کا ماتم بجائے اس کے کہ قوم اپنی صلاحیتوں اور استعداد کو کسی تعمیری کام میں صرف کرے اسی ادھیڑ بن میں لگی رہتی ہے اور کولھو کے بیل کی طرح صبح سے شام تک چلنے کے باوجود رہتی وہیں کی وہیں ہے۔ گذشتہ ماہ ڈیفنس کونسل سے قطع علائق کا مسئلہ بیم ورجا کے مدوجزر کے متعدد مراحل سے گزر کر مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کی گودی میں جاکر ختم ہوگیا تو مشوش قلوب کو کچھ سکون ہوا کہ۔

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

لیکن اس کے بعد ہمارے بھائی جناب فضل الحق صاحب کی طرف سے جس جنون آمیز شورش کا طوفان اٹھا وہ سکون و قرار کو خس و خاشاک کی طرح اپنے ساتھ بہا کر لے گیا ہمیں جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے جناب فضل الحق صاحب کے خلوص میں کبھی شبہ نہیں ہوا لیکن مشکل یہ ہے کہ کبھی کبھی ان کی ناعاقبت اندیشی اور عدم تدبر اس حد تک جا پہنچتا ہے کہ وہ قوم کے لئے ایک انوکھی مصیبت کا سامان پیدا کر دیتا ہے ناعاقبت اندیش انسان بالعموم مغلوب الغضب اور سریع الغیظ ہوتا ہے ذرا سی مخالفت اس کے خون کو کھولا دینے کے لئے کافی ہوتی ہے وہ چھوٹی

چھوٹی باتوں پہ بھڑک اٹھتا ہے اور اس کے بعد اسے بالکل ہوش نہیں رہتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور کیا کر رہا ہے کچھ عرصہ کے بعد جب مشتعل جذبات کا سیلاب تھمتا ہے تو وہ حسرت آمیز نگاہوں سے اپنی عقل و خرد کی کشتی کے ٹوٹے تختوں کو دیکھتا ہے اور اپنے کئے پر پشیمان ہوتا ہے۔ ایسے افراد کے لئے امن و سلامتی کی ایک ہی راہ ہے اور وہ راہ ہے امیرِ ملت کی اطاعت بے غل و غش اطاعت۔ بلا چون و چرا اطاعت۔ خلوص جب اطاعت کے قالب میں ڈھل جائے تو ایک ایسی جوہر دار شمشیر میں منتقل ہو جاتا ہے جس کی کاٹ بے پناہ ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہ اطاعت کی پابندیوں سے آزاد ہو جائے تو عدمِ تدبر کے باعث ایک ایسی مصیبت بن جاتا ہے جس کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جناب فضل الحق صاحب کا عدمِ تدبر اس وقت تک نبھتا چلا جا رہا تھا کہ وہ اپنے خلوص کو امیرِ ملت کی اطاعت میں محصور کرتے تھے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ابھی پچھلے دنوں جب انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی مفاہمت کی غرض سے مختلف جماعتوں کے نمائندوں کے ایک اجتماع کی اسکیم سوچی تھی تو اس پر جناب جناح نے تنبیہ کی۔ اس تنبیہ کے جواب میں جناب فضل الحق صاحب نے بلا تکلف و تامل اعلان کیا تھا کہ میرا شیوہ اطاعت ہے۔ میں اپنے قائدِ اعظم سے بالا بالا کوئی قدم اٹھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا (یہ خط و کتابت اخبارات میں شائع ہو چکی ہے) جناب فضل الحق کی روش بڑی مستحسن تھی اور درخورِ ہزار تبریک و تہنیت۔ اور یہ اتنا بڑا جوہر تھا کہ ان کے عدمِ تدبر کے سقم کو اپنی چادر سے ڈھانپے چلا جا رہا تھا۔ لیکن افسوس کہ ڈیفنس کونسل کے مسئلہ میں ان کے مشتعل جذبات ان کے جذبۂ اطاعت پر غالب آ گئے۔ اور وہ ایک جوہر جو ان کی قدر و قیمت کا باعث تھا یوں تباہ ہو گیا۔ ذرا غور فرمائیے کہ انسان مغلوب الغضب ہو کر کیا کچھ کر بیٹھتا ہے۔ غور فرمائیے اور اس سے عبرت پکڑیئے انھوں نے

(۱) ڈیفنس کونسل سے استعفٰی دیا تاکہ ملت میں انتشار نہ پیدا ہو اور ساتھ ہی

(۲) مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ اور کونسل سے استعفٰی دیدیا کہ ملت میں انتشار پیدا ہو جائے پھر

(۳) لیگ کی مجلس عاملہ اور کونسل سے الگ ہو گئے۔ کیونکہ انھیں لیگ کے اربابِ حل و عقد کے خلاف بالعموم اور صدر مسلم لیگ کے خلاف بالخصوص مبینہ شکایات ہیں لیکن

(۴) مسلم لیگ کے باقاعدہ ممبر اور بنگال پراونشل لیگ کے حسب سابق صدر باقی ہیں۔

(۵) وہ مجلس عاملہ اور کونسل کے ممبر تھے ہی۔ اس وجہ سے کہ وہ بنگال پراونشل لیگ کے صدر ہیں۔
اس لئے اگر وہ مجلسِ عاملہ اور کونسل سے علیحدہ ہونا چاہتے تھے تو انھیں اپنی صدارت سے استعفیٰ
ہونا چاہیئے تھا۔ پھر

(۶) انھوں نے بار بار اعلان کیا کہ بنگال کی لیگ قاطبتہً ان کے ساتھ ہے حالانکہ

(۷) بنگال کی لیگ نے کھلے بندوں ان کی اس روش کے خلاف واضح الفاظ میں ریزولیشن پاس کر دیا۔
اور اس پر بھی

(۸) وہ بنگال کی مسلم لیگ کی صدارت سے مستعفی نہ ہوئے۔ اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد

(۹) قوم کو اطمینان دلا رہے ہیں کہ گھبرائیے نہیں۔ میں ۲۶ اکتوبر کو کونسل کے اجلاس میں اپنی پوزیشن
واضح کرونگا۔ حالانکہ

(۱۰) پوزیشن واضح کرنے کا مقام مجلس عاملہ کا اجلاس بمبئی تھا اور اب تو وہ خود کونسل سے استعفےٰ دے
چکے ہیں تو پھر اس میں پوزیشن کس حیثیت سے واضح کریں گے!

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ایک اطاعت کے جذبہ کو چھوڑ کر انھوں نے کس طرح اپنا مرکز ثقل کھویا
ہے کہ طوفان میں بہنے والے کی طرح کہیں پاؤں نہیں جمتا اور بے ربط ہاتھ پاؤں مارے چلے جا رہے ہیں۔

اس باب میں جناب فضل الحق صاحب کی ناعاقبت اندیشی کا سب سے زیادہ افسوسناک مظاہرہ وہ چٹھی ہے جو
انھوں نے اپنے استعفیٰ کے ضمن میں سکریٹری مسلم لیگ کو لکھی اور اخبارات میں شائع کرائی ہے۔ ہم اس چٹھی کے ان بے بنیاد الزامات
وشکایات کو تبصرہ کا مستحق نہیں سمجھتے جو انھوں نے جوش غضب میں پوری جماعت اور اس کے مرکز کے خلاف عائد کئے
ہیں۔ البتہ اس میں ایک بات ایسی ہے جس کے متعلق ہم بصد کرب والم چند آنسو ٹپکانے پر مجبور ہیں۔ انھوں نے
اس اختلافی مسئلہ میں بنگالی مسلمان اور غیر بنگالی مسلمان کی بحث چھیڑ کر اپنے عدم تدبر ہی نہیں بلکہ روحِ اسلامی سے
پوری ناواقفیت بلکہ یوں کہیئے بغاوت کا ثبوت دیا ہے۔ یہ وہ تعصب جاہلیہ کی آواز ہے جو اسلام سے پہلے دنیا کیا
سنائی دی تھی اور جسے مٹانے کے لئے اسلام کا ظہور ہوا تھا۔ ایک مرتبہ کسی مقام پر دو مسلمانوں میں کسی معاملہ پر جھگڑا ہو گیا

جھگڑے نے ذرا طول پکڑا، تو ان میں سے ایک نے اپنے قبیلہ (عوف) کو حمایت کے لئے بلایا اور دوسرے نے اپنے قبیلہ (غطفان) کے حلیفوں کو آواز دی۔ حضور سرورِ کائنات (علیہ التحیۃ والصلوٰۃ) کے سمع مبارک میں یہ آواز پہنچی تو غصہ سے چہرہ تمتما اٹھا۔ فوراً خیمہ سے باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ کیا ابھی تک عہدِ جاہلیت کے امتیازات تمہاری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوئے! یہ عوفی اور غطفانی کی تفریق کفر کی نشانی ہے۔ اسلام ان سب کو مٹانے کیلئے آیا ہے۔ ہمیں بڑا قلق ہوا کہ ہمارے اس بھائی نے اپنے غصہ میں حواس وخرد کا توازن کھو کر کس قدر غیر اسلامی آواز بلند کر دی۔ الحمد للہ کہ بنگال کے مسلمان نے اشخاص پرستی کی بجائے حق پرستی کا ثبوت دیا اور اپنے "وزیر اعظم" کی اس آواز کا جواب اس استحقار و تنفر سے دیا جس کی یہ مستحق تھی۔ بنگال کے مسلمان بھائیو! تم پر اللہ کی رحمتیں ہوں تم نے بڑی ہوشمندی اور اسلام دوستی کا ثبوت دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس باب میں جناب فضل الحق صاحب نے بہم غلطی پر غلطی کر کے اپنے آپ کو اضحوکہ بنا دیا۔

حقیقت میں بندہ بھی بننا نہ آیا　　سمجھتے تھے دل میں خدا ہو گئے ہم

لیکن با ایں ہمہ ہم ابھی تک اپنے اس مغلوب الغضب بھائی سے مایوس نہیں ہیں۔ جیسا کہ جناب جناح نے اپنے بیان میں فرمایا ہے جب ان کے غیظ و غضب کا چڑھتا ہوا دریا کچھ وقت کے بعد سکون آشنا ہوگا تو یہ اپنے کئے پر فوراً پشیمان ہونگے

اس لئے　　عادت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں

خدا کرے کہ شاملہ میں ان کے اشہب عنان گسیختہ کو کوئی نئی ہمیز نہ مل جائے۔

اس تمام حدیثِ الم انگیز میں ایک ٹکڑا بڑا دلچسپ ہے۔ یعنی مسلم لیگ کے فیصلہ کی مخالفت اور جناب فضل الحق صاحب کی حمایت میں سر عبدالحلیم صاحب غزنوی بہت پیش پیش رہے۔ حیرت ہے کہ جناب فضل الحق صاحب نے اتنا بھی نہ سمجھا کہ یہ "حب علیؓ" نہیں "بغض معاویہؓ" ہے جس نے جناب غزنوی کو ان کی حمایت کے لئے بیتاب کر دیا ہے۔ غزنوی صاحب وہی ہیں جنھیں لیگ نے برادری سے خارج کر رکھا ہے۔ افسوس ہوا کہ جناب فضل الحق صاحب کو حمایتی بھی ملے تو کس قسم کے۔

کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

لیکن اس سے زیادہ افسوس ہے خود جناب فضل الحق صاحب پر جنھوں نے ان کی حمایت کا استقبال کیا۔ جس زمانہ میں حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ میں باہمی آویزش تھی تو روم کے قیصر نے حضرت معاویہؓ کو کہلا بھیجا کہ آپ چاہیں تو میں ایک لشکرِ جرار

آپ کی مدد کے لئے بھیجوں۔ آپ نے جواب میں کہا کہ اسے بدبخت! اگر تیرے لشکر نے ادھر کا رُخ کیا تو میں سب سے پہلا سپاہی ہونگا جو حضرت علیؓ کی طرف سے اس لشکر کے خلاف میدانِ جنگ میں آئیگا۔ جناب فضل الحق صاحب کو کم از کم اتنا تو سوچنا چاہیے تھا کہ یہ حمایت کی آواز اٹھ کہاں سے رہی ہے!

جناب فضل الحق صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ "مجھے بنگال اور بیرونِ بنگال کے جمیعت العلماء کے اراکین نے بھی لکھا ہے کہ میں ڈیفنس کونسل سے استعفیٰ نہ دوں" (ہندوستان ٹائمز ۹/۱۱) یہ ایک دلچسپ خبر ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے جمیعت العلماء کی طرف سے اس بیان کی تردید شائع نہیں ہوئی۔ اس لئے یہ استعجاب اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ جنگ یا ڈیفنس کونسل وغیرہ کے مسئلہ میں جمیعت العلماء (یعنی کانگریسی مسلمانوں) کا مسلک واضح ہے۔ اس کے باوجود جناب فضل الحق صاحب کو یہ مشورہ دینا کہ ڈیفنس کونسل سے استعفیٰ نہ دیا مسلمانوں میں تشتت و انتشار پیدا کرنے کی مکروہ کوشش کے سوا اور کیا کہلا سکتا ہے۔ توبہ۔ توبہ۔ انسان جب گرنے پر آتا ہے تو کس طرح اسفل سافلین کے درجے پر پہنچ جاتا ہے! اور جناب فضل الحق صاحب ہیں کہ اس مشورہ کو بھی فخر کے ساتھ شائع فرماتے ہیں!!

غرضیکہ اس افسوسناک واقعہ کے کس کس پہلو پر آنسو بہائیے!

جناب فضل الحق صاحب سے آگے بڑھیے تو لیگ کے وہ اراکین سامنے آتے ہیں جنھوں نے لیگ کے فیصلہ سے اعلانیہ انحراف کیا۔ یعنی بیگم شاہنواز صاحبہ اور سر سلطان احمد صاحب۔ بیگم صاحبہ کو تو چھوڑ دیجئے۔ افسوس سر سلطان احمد صاحب پر ہے۔ وہ نہایت سمجھدار اور معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے والے واقع ہوئے ہیں لیکن اس مسئلہ میں انھوں نے بھی بہت بڑی لغزش کا ثبوت دیا۔ اول تو ملت کے متفقہ فیصلہ کے بعد اپنی جداگانہ روش کے جواز میں بیانات ہی بے معنی چیز ہیں لیکن اگر ان کے بیان کو بھی مان لیا جائے تو جناب جناح نے جس طرح اسکی ایک ایک شق کی تردید کی ہے اسکے بعد ہمارا خیال تھا کہ جناب سر سلطان احمد صاحب اپنی غلطی کا اعتراف کرینگے۔ لیکن افسوس ہوا کہ انھوں نے ایسا نہ کیا اور ملت کی نگاہوں سے اپنا وقار کھو دیا۔

لیکن اس مقام پر ایک اصولی سوال پیدا ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے جماعت کے فیصلہ سے کھلی ہوئی سرکشی اختیار کی ادھر ادھر سے احتجاج کی آواز بلند ہوئیں۔ اسکے بعد فضا ساکت ہوگئی۔ اور یہ حضرات اپنی اپنی جگہ پر "مسلمانوں کے نمایندہ" کی حیثیت سے

اطمینان سے بیٹھے رہے! کیا قوم کے فیصلوں کو ٹھکرانے اور جماعت سے الگ ہو جانے کا کمال فقط اسی قدر ہوتا ہے! اگر اتنا ہی ہے تو پھر قوم کے فیصلہ کی پرواہ کسے ہے! جناب جناح کے پاس کوئی حکومت کے اختیارات ہیں نہیں کہ ملت کے فیصلوں کے خلاف سرتابی کی قرار واقعی سزا دے سکیں۔ انکی قوت تو ملتِ اسلامیہ ہے۔ وہ ملت کے فیصلوں کو ملت ہی کے زور سے منوا سکتے ہیں۔ آیئے ہم دیکھیں زندہ جماعتوں میں جماعت کا ساتھ چھوڑ دینے والوں کا حشر کیا ہوا کرتا ہے! مسلمانوں کی صدرِ اولیٰ میں اس بات کی تو کوئی مثال مل ہی نہیں سکتی کہ کسی مسلمان نے ملت کے فیصلوں کے خلاف عمداً سرکشی اختیار کر کے ملت کا ساتھ چھوڑ دیا ہو۔ البتہ ایک واقعہ ایسا ملتا ہے جس میں تساہل و تغافل کی بنا پر ملت کا ساتھ چھوٹ گیا۔ یہ ایسا اہم واقعہ تھا کہ اسکی اصل کو قرآن کریم نے اپنی دفتین میں اور اسکی تفصیل کو تاریخ نے اپنے اوراق میں محفوظ کر کے رکھ لیا کہ آنیوالوں کیلئے موجبِ عبرت و موعظت ہو۔ وہ واقعہ جس کا تذکرہ سورہ توبہ کی ان آیاتِ جلیلہ میں ملتا ہے۔ وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ط ..... اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ ۱۱۸

(اور اسی طرح) ان تین اشخاص پر بھی (اسکی رحمت لوٹ آئی) جو (معلق حالت میں) چھوڑ دیئے گئے تھے۔ جبکہ زمین اپنی تمام وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی تھی اور وہ خود بھی اپنی جان سے تنگ آ گئے تھے اور انھوں نے جان لیا تھا کہ اللہ سے بھاگ کر انھیں کوئی پناہ نہیں مل سکتی مگر خود اسی کے دامن میں۔ پس اللہ (اپنی رحمت سے) انکی طرف لوٹ آیا تاکہ وہ رجوع کریں۔ بیشک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔ رحمت والا ہے۔

یہ تین شخص کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) تھے۔ ان سے غزوۂ تبوک میں کوتاہی ہوئی اور جہاد میں شریک نہ ہو سکے۔ ان میں سے حضرت کعب بن مالکؓ نے یہ واقعہ خود بیان فرمایا ہے۔ بہتر ہے کہ آپ خود انہی کی زبانی سن لیں۔ وہ کہتے ہیں

"غزوۂ تبوک کے زمانہ میں جو فارغ البالی اور قوت جمع حاصل تھی وہ اس سے پہلے کبھی میسر نہ آئی تھی اسوقت میرے پاس دو دو اونٹنیاں تھیں۔ اس وقت موسم سخت گرم تھا۔ سفر دور دراز کا تھا۔ دشمن بڑی تعداد میں تھا اسلئے حضورؐ نے مسلمانوں کو وضاحت سے تلقین فرما دی کہ وہ پوری پوری تیاری کر لیں حضورؐ کے ساتھ اسوقت جاں نثاروں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ رجسٹر میں انکی نام نہ آ سکے اسلئے کوئی پڑتال بھی نہ ہو سکتی تھی کہ کون رک گیا اور کون ساتھ ہے۔ اسوقت پھل پکے ہوئے تھے۔ سائے بڑھے ہوئے تھے۔ مسلمان مجاہدؓ اور خود حضورؐ جہاد کی تیاریوں میں مشغول تھے۔ میری یہ حالت تھی کہ صبح نکلتا تھا کہ سامان تیار کر لوں لیکن ادھر ادھر شام ہو جاتی اور میں خالی ہاتھ گھر لوٹ آتا۔ لیکن کہتا کہ کوئی بات نہیں۔ روپیہ میرے پاس موجود ہے کل خرید لونگا اور تیاری کر لونگا۔ یہاں تک کہ یونہی صبح شام کرتے کرتے کوچ کا دن آ گیا اور مجاہدین کا لشکر سوئے تبوک کوچ کر گیا۔ میں نے کہا کوئی نہیں۔ ایک دو دن میں میں بھی پہنچتا ہوں لیکن اسی تساہل میں وقت اور گذر گیا۔ لشکر دور چلا گیا۔ میں نے کہا خیر بعد مسافت کا کیا ہے۔ میں تیز چل کر ساتھ جا ملوں گا۔ لیکن افسوس کہ مجھ سے یہ بھی

نہ ہوسکا۔ اور ارادوں ہی ارادوں میں رہ گیا۔ اب تو یہ حالت تھی کہ میں بازار میں نکلتا تو مجھے منافقوں کے اور بچارے لولے، لنگڑے، اندھے مریضوں اور معذور لوگوں کے کوئی اور نظر نہ آتا" ـــــ یہ تھا جرم ـــــ اب اس کے بعد جب میں نے سنا کہ حضورؐ واپس آرہے ہیں تو تب میری آنکھیں کھلیں۔ لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ حضورؐ حسب معمول پہلے مسجد میں تشریف لائے اور جو لوگ کوچ میں شریک نہیں ہوئے تھے وہ آ آ کر معذرتیں کرنے لگے اور قسمیں کھا کھا کر اپنی سچائی کا یقین دلانے لگے۔ انھوں نے جو کچھ ظاہر کیا حضورؐ نے قبول فرمالیا اور ان کے دلوں کا معاملہ خدا پر چھوڑ دیا۔ جب میری طرف متوجہ ہوئے تو مجھ سے یہ نہ ہوسکا کہ کوئی جھوٹی معذرت بنا کر کہدیتا۔ جو کچھ سچی بات تھی صاف صاف عرض کردی۔ آپ نے سن کر فرمایا اچھا جاؤ اور انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کردے۔ میں نے لوگوں سے پوچھا اور بھی کسی کو ایسا حکم ہوا ہے؟ لوگوں نے کہا ہاں۔ مرارہ بن ربیعؓ اور ہلال بن امیہؓ کو ـــــ اس کے بعد حضورؐ کا حکم ہوا کہ ہم تینوں سے کوئی بات چیت نہ کرے تو سب نے منہ پھیر لیا۔ اچانک دنیا کچھ سے کچھ ہوگئی۔ مجھے اپنا وطن پردیس معلوم ہونے لگا۔ میرے دونوں شریک ابتلا گھر میں بند ہوکر بیٹھ رہے تھے لیکن میں سخت جان تھا۔ اس حالت میں بھی روز گھر سے نکلتا۔ مسجد میں حاضری دیتا۔ جماعت میں شریک ہوتا اور پھر ایک گوشہ میں سب سے الگ بیٹھ جاتا اکثر ایسا ہوتا کہ میں حضورؐ کے قریب جاکر سلام عرض کرتا اور پھر اپنے جی میں کہتا دیکھوں سلام کے جواب میں آپکے لبوں کو حرکت ہوتی ہے یا نہیں۔ آپ گوشہ چشم سے میری طرف دیکھ لیتے۔ لیکن جب میری نگاہ شوق اٹھتی تو رخ پھر جاتا۔"

یہ حالت عام جماعت کی طرف سے ہوئی۔ لیکن خود اپنے رشتہ داروں کی طرف سے کیا ہوا؟ فرماتے ہیں، "ایک دن شہر سے باہر نکلا اور اپنے چچیرے بھائی ابو قتادہؓ کے باغ کی دیوار سے کود کر ان کے پاس گیا۔ وہ میرے تمام عزیزوں میں سب سے زیادہ محبوب تھے۔ میں نے سلام کیا۔ مگر انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے کہا۔ ابو قتادہؓ! کیا تم نہیں جانتے کہ میں مسلمان ہوں اور اللہ اور اس کے رسول کی محبت اپنے دل میں رکھتا ہوں؟ اس پر بھی اس نے میری طرف رخ نہ کیا۔ لیکن جب میں نے یہی بات بار بار دہرائی تو صرف اتنا کہا کہ "اللہ ورسولہ اعلم" اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے۔ تب مجھ سے ضبط نہ ہوسکا اور بے اختیار آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔"

غور فرمایا آپ نے اس مرد مومن کے جواب پر۔ میرا علم اللہ اور اس کے رسول کے فیصلہ میں کیا حقیقت رکھتا ہے۔ اللہ اکبر! کتنا بلند مقام تھا ان حضرات کے جذبۂ اطاعت و امتثال کا ـــــ اب اس مصیبت میں ایک اور ابتلا کا اضافہ دیکھئے۔ فرماتے ہیں وہاں سے واپس ہوا تو راستہ میں شام کا ایک قبطی مل گیا۔ وہ لوگوں سے میرا پتہ پوچھ رہا تھا۔ لوگوں نے میری طرف اشارہ کرکے بتایا تو اس نے شاہ غسان کا ایک خط نکال کر میرے حوالہ کیا۔ اسمیں لکھا تھا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمھارے سردار نے تم پر سختی کی ہے تم ہمارے پاس چلے آؤ۔ ہم تمھاری قدر و منزلت کریں گے۔ خط پڑھ کر میں نے کہا کہ لو! یہ ایک اور مصیبت آئی۔ میں نے اس رقعہ کو جاکر چولھے میں ڈال دیا"

غور فرمایا آپ نے! اب اور آگے بڑھیے۔

" اس حالت پر چالیس راتیں گذر گئیں، تو حضورؐ کی طرف سے ایک آدمی آیا اور کہا حکم ہوا ہے کہ تم اپنی بیوی سے الگ ہو جاؤ۔ میں نے پوچھا کہ کیا طلاق دیدوں؟ کہا نہیں۔ صرف علیحدگی کا حکم ہے۔ اس پر میں نے اپنی بیوی کو میکے بھیج دیا۔ جب دس دن اور

گزر گئے تو صبح کے وقت میں اپنے مکان کی چھت پر نماز پڑھ کر بیٹھا تھا اور ٹھیک ٹھیک وہی حالت تھی جس کا نقشہ قرآن کریم نے کھینچا ہے۔ زندگی سے تنگ آگیا تھا۔ اور خدا کی زمین اپنی تمام وسعتوں کے باوجود مجھ پر تنگ ہو چکی تھی۔ اتنے میں کیا سنتا ہوں کہ کوئی آدمی کوہ سلع سے پکار رہا ہے کہ "کعب بن مالک خوش ہو جا۔ تمہاری توبہ قبول ہو گئی۔"

کس قدر مبارک تھا وہ سماں اور کیسی سہانی تھی وہ گھڑی۔ پھر فرماتے ہیں "لوگ جوق در جوق مجھے مبارکباد دینے کیلئے دوڑے۔ جب وہ شخص میرے پاس آیا جس نے سب سے پہلے آواز دی تھی تو میں نے اپنے دونوں کپڑے اتار کر اسے انعام میں دیدیئے۔ اسوقت میرے پاس کچھ اور نہیں تھا۔ میں نے خود دوسرے کپڑے مانگ کر پہنے۔ جب مسجد میں حاضر ہوا تو حضور لوگوں کے حلقہ میں تشریف فرما تھے۔ میں نے دیکھا کہ چہرۂ مبارک چمک رہا تھا۔ فرمایا کعب! تمہیں اس دن کی بشارت دیتا ہوں جو تیری زندگی کا سب سے بہتر دن ہے۔"

حضرت کعبؓ! آپ کی خوش بختی پر دنیا بھر کی خوش بختیاں قربان ہو جائیں! لیکن سنئے اس کے بعد انھوں نے کیا کہا۔ فرماتے ہیں "میں نے عرض کیا۔ یہ بات آپ کی جانب سے ہوئی یا اللہ کی وحی ہے۔ فرمایا۔ اللہ کی وحی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ میری توبہ قبول کرلے تو میں اپنا سارا مال اس کے نام پر صدقہ کر دوں۔ سو وہ حاضر ہے۔"

واقعہ آپ کے سامنے ہے۔ اس کی روشنی میں سوچئے کہ اگر قوم میں زندگی کی رمق ہوتی تو جماعت کے فیصلہ سے انحراف کرنیوالے اپنی رکھشی سے پہلے دس مرتبہ عواقب کے متعلق سوچا کرتے؟ آپ نے دیکھا ہے کہ ان چھوٹی چھوٹی برادریوں میں جنھیں آپ اپنے زعم باطل میں حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، کس قدر ضبط و انضباط اور اطاعت و امتثال پائی جاتی ہے۔ ان میں کسی کی مجال نہیں کہ برادری کے فیصلہ سے سرتابی اختیار کرے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس انحراف سے برادری "حقہ پانی چھین دیگی" اور پھر دنیا میں اس کے لیے کوئی پناہ کی جگہ نہ ہوگی! اے کاش ہم میں آج اتنا احساس ہی باقی ہوتا۔۔!!

ایک معذرت

طلوع اسلام اپنے یوم اشاعت سے آجتک بالعموم اسّی صفحات کی ضخامت پر مشتمل رہا ہے۔ اکثر یہ ہوا کہ اس کی ضخامت سو صفحات تک بھی بڑھ گئی۔ لیکن کم از کم اسّی تو ضرور رہی۔ لیکن اشاعتِ حاضرہ ۶۴ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی وجہ کاغذ کی وہ ہوشربا گرانی ہے جو کسی سے چھپی ہوئی نہیں۔ وہی کاغذ جسے تین روپیہ بارہ آنہ میں خریدا کرتے تھے اس ماہ دس روپیہ فی ریم کے حساب سے خریدا گیا ہے۔ اور پھر گرانی ہی نہیں کمیابی اور بعض اوقات نایابی اور بھی پریشان کن ہے۔ ان حالات کے ماتحت ہم نہیں کہہ سکتے کہ جرائد و رسائل کا مستقبل کیا ہوگا۔ لیکن فی الحال ہم اس پر مجبور ہو گئے ہیں کہ ضخامت میں ایک جزو کم کردی جائے۔ امید ہے قارئین ہماری مجبوری کے پیشِ نظر ہماری معذرت قبول فرمائیں گے۔

نجات کا قرآنی نظریہ

دنیائے مذاہب میں انسانی زندگی کی تمام تگ و تاز کا منتہیٰ کیا ہے؟ یہ اپنے اوپر اس قدر جانگسل پابندیاں کیوں عائد کرتا ہے، اتنی مشقتیں کیوں اٹھاتا ہے؟ یہ بھوک اور پیاس کی جگر سوز تکالیف۔ یہ مال و جان کی قربانیاں۔ یہ صعوبات سفر، یہ سختیہائے منازل۔ یہ تمام جد و جہد۔ یہ صبر آزما سعی و کاوش بالآخر کس غرض و غایت کیلئے ہے؟ آپ کسی سے پوچھئے۔ ان تمام سوالات کا ایک اور صرف ایک جواب ملیگا یعنی اس تمام تگ و دو کا مقصود یہ ہے کہ کسی طرح **نجات** حاصل ہوجائے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، یہودی، پارسی ہر ایک کی مذہبی کد و کاوش کا ماحصل ایک لفظ نجات کے اندر مضمر ہے۔ اسی کے لئے دعائیں ہیں۔ اسی کے لئے التجائیں ہیں۔ یہی تمام آرزوؤں کا مرکز ہے۔ یہی سب تمناؤں کا محور ہے۔ آہ سحرگاہی ہے تو اسی کے لئے، نالۂ شبگیر ہے تو اسی غرض سے۔ جھکتی ہوئی پیشانیوں کی سجدہ ریزیاں اور لرزتے ہوئے قلوب کی نوحہ خیزیاں۔ دکھتی ہوئی آنکھوں کی شبنم فشانیاں اور لڑکھڑاتی ہوئی زبانوں کی تسبیح خوانیاں۔ سب اسی ایک مقصد کے حصول کے ذرائع اور اسی ایک منزل تک پہونچنے کی راہیں ہیں۔ برہمن کے ناقوس میں۔ ملا کی اذان میں۔ گرجا کی بانگ جرس میں۔ صومعہ کی پکار میں۔ اسی محمل لیلےٰ کی تلاش کی تڑپ اور اسی ناقۂ سلمیٰ کے سراغ کی خلش پنہاں ہے۔ اس تمام سوز و گداز اور اس تمام تگ و تاز کا منتہیٰ ہے۔ **نجات**!

لیکن سوال یہ ہے کہ نجات سے مقصود کیا ہے؟ مقصود ہی میں اختلاف ہے اور اسی کا تعین اس وقت پیش نظر ہے۔

ہندوؤں کے نزدیک انسان اپنے اس جنم میں کسی پچھلے جنم کے گناہوں کی سزا بھگت رہا ہے۔ اس کا نام تناسخ کا چکر ہے۔ جب تک اس سے گناہ سرزد ہوتے رہیں گے۔ یہ چکر قائم رہیگا لہٰذا اس کی تمام جد و جہد کا منتہیٰ یہ ہے کہ روح (آتما) اس آواگون کے چکر سے مخلصی حاصل کرلے۔ اسی کا نام نجات ہے۔ یہی مکتی کہلاتی ہے۔

بدھ مت میں بھی نجات کا یہی تصور ہے۔ ان کے نزدیک انسان کی ہر آرزو ایک تکلیف کا پیش خیمہ ہے۔

جوں جوں آرزوئیں بڑھتی جائینگی۔ تکالیف میں زیادتی ہوتی جائیگی اس لئے تکالیف کو ختم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آرزوؤں کو ترک کردیا جائے۔ جب آرزوئیں کلیتہً فنا ہوجائینگی تو انسان کی روح تکالیف کے بندھن سے چھوٹ کر نروان حاصل کرلیگی۔ اسی کا نام نجات ہے

عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر بچہ اپنے باپ (آدمؑ) اپنی ماں (حوّا) کے اوّلین گناہ کی مصیبت کو اپنے ساتھ لیکر پیدا ہوتا ہے اور اس "ازلی" مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنیکا ایک ہی طریقہ ہے کہ حضرت مسیح کے کفارہ پر ایمان لایا جائے۔ یہ عقیدہ انسان کو اسکے پیدائشی گناہ سے نجات دلاکر جنت میں داخل کر دیگا۔ یہ اُن کے ہاں نجات یا (Salvation) ہے۔

یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ وہ اپنے مورثین اعلےٰ کے بعض جرائم کی پاداش میں گنتی کے دنوں تک عذاب میں رہیں گے اس کے بعد انہیں اس عذاب سے رہائی مل جائے گی۔ اس کا نام نجات ہے۔

مجوسیوں کے نزدیک انسان اس دنیا میں اہرمن یزداں (نور اور ظلمت) کی رزمگاہ میں گرفتار کشمکش ہے۔ اس کشمکش سے مخلصی حاصل ہوجانا نجات ہے۔

نجات مکتی یا Salvation کا قریب قریب یہی تخیل اور چھوٹے چھوٹے مذاہب میں بھی ہے۔ اس تخیل کی جزئیات میں اختلاف ہو تو ہو لیکن ان سب میں ایک قدر مشترک ہے۔ یعنی اُن کے عقیدہ نجات میں پہلے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انسان مصیبت میں گرفتار ہے اور اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا نام نجات ہے۔ نجات کے معنی ہی چھٹکارا حاصل کرنے، خلاصی پا لینے کے ہیں۔ اسی تخیل کا نتیجہ ہے کہ اُن کے ہاں انسان کے جسم کو روح کا قفس اور اس دُنیا کو انسان کے لیے جیل خانہ قرار دیا گیا ہے۔

یہ سب کچھ تو دیگر مذاہب کے متعلق ہوا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسلام میں بھی نجات سے یہی مفہوم ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے ہاں

(۱) نہ تو انسان کسی پچھلے جنم کے گناہوں کی سزا بھگتنے کیلئے اس مجلس آب و گل میں بھیجا گیا ہے

(۲) نہ آرزوئیں اور تمنائیں ایسا شجر ممنوعہ ہیں کہ اُن کے چھونے سے مصائب کی بندشیں گلے پڑ جاتی ہیں۔

(۳) نہ کوئی بچہ پیدائشی گنہگار پیدا ہوتا ہے۔

اس لئے اُن کے ہاں نجات سے مفہوم کسی مصیبت یا بندھن سے مخلصی حاصل کر لینا نہیں ہو سکتا۔ جب یہ تسلیم ہی نہیں کیا گیا کہ انسان کسی مصیبت میں گرفتار ہے تو اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا مفہوم ہی باطل ہے۔ لیکن ہمارے ہاں یہ لفظ اس کثرت اور اتنی مدت سے استعمال ہوتا چلا آرہا ہے کہ ہمارے ہاں بھی انسانی تگ و دو کا منتہی کچھ ایسا ہی قرار پا گیا ہے۔ یعنی ہمارے ہاں نجات سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے اعمالِ بد کی سزا بھگتنے کے لئے دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے اور سزا بھگتنے کے بعد جنت کی طرف منتقل کر دیئے جائیں گے۔ عذاب جہنم سے اس چھٹکارے کا نام نجات ہے۔ لیکن قرآن کریم میں اس مفہوم کے لئے نجات کا لفظ کہیں استعمال نہیں ہوا۔ اس لفظ یا اس کے مفہوم

کی ترویج سے مسلمانوں میں نجات کے متعلق ایک غلط نظریہ رواج پذیر ہو گیا اور مکافاتِ عمل کا وہ عظیم الشان قرآنی نظام جو انسانی تگ و تاز کے نتیجے کی حیثیت سے علم و بصیرت کی بنیادوں پر استوار دائمی قدرت کے مطابق ہے نگاہوں سے اُوجھل ہو گیا۔

قرآن کریم میں نجات کا لفظ دنیاوی غم و آلام، دشمنوں کے مکر و حیل، سرکش و جابر قوتوں کے ظلم و استبداد اور دیگر اسی قسم کی صعوبات و مشکلات سے چھٹکارا پانے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً بنی اسرائیل نے فرعون کے مظالم سے رہائی پانے کے کا ذکر نَجَّيْنَا اور اَنْجَيْنَا جیسے الفاظ میں ہوا ہے (يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ
۲۰/۸۰ - اے بنی اسرائیل ہم نے تمہیں تمہارے دشمنوں سے نجات دلائی) حضرت ھود، صالح، شعیب علیہم السلام کی اقوام کی فتنہ پردازیوں سے محفوظ رکھنے کا ذکر بھی انہی الفاظ میں کیا گیا ہے (وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝ ۱۱/۵۸، ۶۶، ۹۴ ہم نے انھیں سخت عذاب سے نجات دی) حضرت ابراہیمؑ کی آتشِ نمرود سے رستگاری کے لئے بھی فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ۲۹/۲۴ (اللہ نے اُسے آگ سے نجات دلائی) کے الفاظ آئے ہیں۔ حضرت یونسؑ کو غم و آلام سے رہائی ملنے کے لئے بھی وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ۭ وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ۲۱/۸۸ (ہم نے اُسے غم سے نجات دلائی اور ہم اسی طرح مومنین کو (تکالیف سے) نجات دلاتے ہیں) غرضیکہ حضرات انبیاء کرامؑ اور اُن کے متبعین کے اس قسم کی تکالیف و مصائب سے مخلصی حاصل ہونے کے لئے نجات کا لفظ استعمال کیا گیا ہے

ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ۱۰/۱۰۳

پھر ہم اپنے رسولوں کو اور اُن لوگوں کو جو ایمان لائے تھے (ان مصائب سے) نجات دی۔

اور اسی طرح (اب بھی) ہم پر مومنین کو (ایسی مشکلات سے) نجات دلانا واجب ہے۔

لیکن یہ سب اسی دُنیا کے نامساعد حالات سے مخلصی حاصل کرنے کے لئے ہے۔ حیاتِ اُخروی میں عذاب میں گرفتار ہو کر اس سے مخلصی حاصل ہونے کا کوئی تذکرہ نہیں۔ بعض مقامات پر اس کے معنی مصیبت اور عذاب سے محفوظ رکھے جانے کے بھی ہیں یعنی عذاب میں گرفتاری کے بعد چھٹکارے کے بجائے عذاب سے محفوظ رکھے جانا۔

جب خدا کے فرستادہ، قوم لوط کو عذاب میں ماخوذ کرنے کے لئے، حضرت ابراہیمؑ کے پاس آئے تو

قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ۭ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا ڭ لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ

(۲۹/۳۲)

ابراہیم نے کہا کہ اس (بستی) میں تو لوط بھی موجود ہے۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ ہمیں خوب معلوم ہے کہ وہاں کون کون ہے۔ ہم یقیناً لوط اور اس کے متبعین کو (اس عذاب سے) محفوظ رکھیں گے

انہی معنوں میں دربارِ فرعون کے مردِ مومن نے نجات کا لفظ استعمال کیا تھا جب اس نے اپنی قوم کو مخاطب کرکے کہا

وَ يٰقَوْمِ مَا لِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَ تَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ ۝ ۴۱/۴۰

اے میری قوم یہ کیا ہے؟ کہ میں تو تمہیں نجات[1] کی دعوت دیتا ہوں اور تم مجھے آگ کی دعوت دیتے ہو۔

یعنی میں تمہیں آگ سے بچنے کا طریق بتاتا ہوں اور تم مجھے آتشِ دوزخ کے گڑھوں کی طرف دھکیلنے کی کوشش کرتے ہو؟ نجات کا یہ وہی مفہوم ہے جس کے لئے مومنین کو یہ دعائیں سکھائی گئی ہیں۔ کہ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۳/۱۹۰ (اے اللہ ہمیں عذابِ نار سے محفوظ رکھیو) اور یہ حفاظت اس انداز سے ہوئی کہ

اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۝ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ج ۲۱/۱۰۱-۱۰۲

یقیناً وہ لوگ جن کے لئے ہم نے پہلے سے بھلائی کا حکم دیدیا تو وہ دوزخ سے دور رکھے جائیں گے (اتنے دُور کہ) اس کی بھنک بھی اُن کے کانوں میں نہیں پڑے گی۔

قرآن کریم میں نجات کا لفظ انہی معانی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی۔

(۱) مصائب و آلام میں گرفتار کو اُن سے چھٹکارا دلانا۔ یہ مفہوم اس دُنیا کی تکالیف و صعوبات سے متعلق ہے۔ اُخروی عذاب سے نہیں

(۲) عذاب و مصائب سے محفوظ رکھنا۔ یہ مفہوم اس دُنیا کی تکالیف اور عالمِ اُخروی کے عذاب دونوں سے متعلق ہے۔

لہٰذا نجات سے یہ مفہوم نہیں کہ عذابِ اُخروی میں گرفتاری کے بعد چھٹکارا مل جائے۔ اس لئے

---

[1] اس سے مفہوم فرعون کے استبداد سے نجات بھی ہو سکتا ہے۔

کہ قرآن کریم کی رُو سے عذاب و ثواب اور جہنم اور جنّت کا تصور اس سے جداگانہ ہے۔ اس کی تفصیل آئندہ اوراق میں ملے گی۔

قرآنِ کریم میں انسانی جد وجہد کے منتہیٰ کے لئے نجات یا مکتی کے بجائے فلاح (Success) اور فوز (Achievement) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور جو باریک لیکن عظیم الشان فرق ان دونوں (نجات اور فلاح و فوز) میں ہے ارباب بصیرت سے پوشیدہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر بنگاہ تعمق دیکھا جائے تو اس باریک سے فرق سے معلوم ہو سکتا ہے کہ پیغامِ خداوندی اور ذہنِ انسانی کے تراشیدہ تخیلات میں کسقدر نمایاں فرق ہے۔ نجات یا مکتی کا عقیدہ یہ تصور پیدا کرتا ہے کہ انسان پیدائش سے پہلے، کسی خاص حالت میں تھا۔ پیدائش کے بعد وہ اس خاص حالت سے گر گیا۔ اب یہ مختلف ادوار و منازل میں چکر لگا رہا ہے کہ اس کھوئی ہوئی حالت کو پھر سے پالے۔ یعنی جس مقام سے گرا تھا۔ پھر وہیں پہنچ جائے۔ یہی اُسکی تمام تگ و دو کا منتہیٰ ہے۔ یہی اُسکی تخلیق کی غرض و غایت ہے۔ لیکن غور کیجئے کہ کائنات کا یہ اس قدر حیرت انگیز سلسلۂ نظم و نسق۔ موجودات عالم کا باہمی ربط و ضبط۔ یہ ہر شے کا اپنے اپنے فرائض کی تکمیل میں جذب و انہماک۔ یہ تمام سلسلۂ رشد و ہدایت اور نظامِ وحی و رسالت۔ کیا یہ سب کچھ محض اس لئے ہے کہ جس حالت میں انسان پہلے تھا پھر سے اُسی حالت میں پہنچ جائے! یہ مقصد تو کوئی مقصد نہیں۔ یہ غرض تو کچھ خاص غرض نہیں۔ اگر انسان کو انسانیت سے پہلے کی حالت میں ہی پہنچانا مقصود فطرت تھا تو اُسے اُس منزل سے انسانیت کی منزل میں لانا ہی کیا ضروری تھا؟ یہ تو فعلِ عبث ہے۔ مٹی سے کھلونا بنانا اور کھلونے کو توڑ کر پھر مٹی میں تبدیل کر دینا (اُسکی پہلی حالت پر لیجانا) یہ تو بچوں کا کھیل ہے (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) کسی حکیم کا فعل قرار نہیں دیا جا سکتا! لیکن نجات اور مکتی کا نظریہ تو تخلیق انسانی کی غرض و غایت اس سے آگے نہیں لیجاتا۔ اس کے برعکس فلاح و فوز کے الفاظ ہمیں بتاتے ہیں کہ انسان اس دُنیا میں کسی اعلیٰ و ارفع مقصد (ACHIEVEMENT) کے حصول کی تیاری کر رہا ہے۔ اپنی پچھلی حالت کی طرف لوٹنے کے لئے پیدا نہیں کیا گیا۔ وہ اسکی ابتداء لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَذْكُورًا ۷۶ (ایک ناقابلِ ذکر غیر اہم شے) بتاتا ہے۔ اس لئے انسانیت کے درجہ میں پہنچنے کے بعد پھر اسی "ناقابلِ ذکر" مقام کا حصول قرآن کے نزدیک حقائق سے بے خبری کی دلیل ہے۔ انسان کا علم و بصیرت۔ اس کے تجارب و مشاہدات

نے آج یہ حقیقت بے نقاب کر دی ہے کہ کائنات کے ذرہ ذرہ میں حیات (Life) اپنے ارتقائی مدارج طے کر رہی ہے۔ جو نوع (Species) اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کر لیتی ہے کہ وہ تنازع للبقا (Struggle for Existence) کی رزمگاہ میں اپنے آپ کو اصلح (The Fittest) ثابت کر دے وہ سلسلۂ ارتقاء کی ایک اور منزل طے کر کے ایک مقام آگے بڑھ جاتی ہے جو یہ صلاحیت پیدا نہیں کرتی وہ وہیں رک جاتی ہے زندگی (Life) نہ پیچھے مڑتی ہے نہ بار بار اپنا اعادہ کرتی ہے یعنی حیات کی حرکت دَوری نہیں ارتقائی ہے۔ اس میں رجعت و تکرار نہیں بلکہ عروج و ارتقاء ہے۔ خاک کے ذرّات اسی قانون مشیّت کے ماتحت ارتقائی منازل طے کرتے کرتے انسان کی سطح تک آ گئے۔ سلسلۂ ارتقاء کی اس نئی لیکن اہم کڑی۔ یعنی انسانیت میں ایک جدید جوہر کا اضافہ ہوا۔ یعنی اس میں شعور و ادراک پیدا ہو گیا جو مستلزم ہے اُس کے اختیار و ارادہ کا۔ اختیار و ارادہ ہی وہ جوہر ہے جس سے انسان موجوداتِ عالم میں سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ یہی وہ امتیاز ہے جس سے یہ مسجودِ ملائک اور مخدومِ کائنات قرار پایا ہے۔ انسان کا بچہ یہ جوہر اپنے ساتھ لیکر کارزارِ عالم میں داخل ہوتا ہے۔ جسکی پوری وسعتیں اُسکے سامنے ہیں۔ وہ ان قوتوں سے آراستہ کر کے اس میدان میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جہاں وہ ایک سفید لوح (Clean Slate) لیکر آیا ہے۔ اسے راستہ کے نشیب و فراز سے آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ زندگی کے ہر دوراہے پر نشانات کے کھمبے (Sign Posts) لگا دیئے جاتے ہیں۔ منزل کا نشان بتا دیا جاتا ہے اور اس کے بعد کہہ دیا جاتا ہے کہ اب تمہیں اپنی سعی و عمل سے فلاں منزل تک پہنچنا ہے۔ جو وہاں تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ فائز المرام ہے۔ جو نہیں پہونچتا وہ خاسر و ناکام ہے۔ غور فرمائیے قرآن کریم نے ان کڑیوں کو کس حسین و دلکش انداز میں بیان فرمایا ہے۔ سورۂ الدّھر میں ہے

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ۝ ۷۶/۱	انسان پر یقیناً وہ زمانہ بھی گذرا ہے کہ وہ کوئی ایسی شے نہیں تھا جس کا ذکر کیا جائے۔

یہ ابتدائی درجہ تھا۔ اس کے بعد درمیانی درجوں کو چھوڑ کر "حیوانیت" اور "انسانیت" کے مراحل کا ذکر ہے

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝ ۷۶/۲	ہم نے انسان کو مخلوط نطفہ سے پیدا کیا۔ تاکہ اُسکی آزمائش کی جائے۔ سو اُسے سننے والا۔ دیکھنے والا بنایا۔

مخلوط نطفہ سے تخلیق، درجہ حیوانیت ہے۔ لیکن انسان کو سماعت و بصارت (ذرائعِ علم) عطا کئے گئے۔ اس لئے

کہ اُسے اختیار و ارادہ دیکر آزمائش کے میدان میں چھوڑا گیا ہے کہ اُن میں سے کون اگلی منزل تک جاتا ہے اور کون راستہ ہی میں بھٹک جاتا ہے۔ اسے سمع و بصر عطا کیا اور اس کے ساتھ ہی وحیٔ آسمانی کی قندیلِ نورانی سے راستہ کے نشیب و فراز اور خم و پیچ سے آگاہ کر دیا۔

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ۝ ۷۶/۳ — یقیناً ہم نے اسے راستہ دکھا دیا (اب یہ اس کے اختیار میں ہے کہ صحیح راہ) قبول کرے یا اس سے انکار کر دے۔

اس کے بعد کی دو آیات میں ہے کہ صحیح راہ سے انکار کرنیوالوں کا مقام جہنم ہے اور راہِ راست پر چلنے والوں کی منزل جنت۔ یعنی انسان جب دُنیا میں آتا ہے تو وہی قانونِ ارتقاء جو اس سے پہلی کڑیوں میں جاری و ساری تھا۔ اس پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ مغرب کے مادّیین کے نزدیک، انسان اس سلسلہ ارتقار کی آخری کڑی ہے۔ یعنی وہ زندگی (LIFE) جو اس قدر کٹھن منازل طے کر کے درجہ بدرجہ (طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ۔ ۸۴/۱۹) یہاں تک پہنچی تھی۔ اسکے بعد ختم ہو جائیگی! کس قدر خلاف علم و بصیرت نظریہ اور انسانیت کی کتنی بڑی تذلیل!! قرآن کریم اس مقام سے آگے بڑھتا ہے اور علیٰ وجہ البصیرت کہتا ہے کہ عقل و علم کے یہ مدعی کس دھوکے میں پڑ گئے! زندگی کا ارتقائی سلسلہ ختم نہیں ہو گیا۔ حقیقی ارتقار تو بلکہ اب شروع ہو گا۔ یہ تو شعور و ادراک اور زندگی کے اختیار و ارادہ کی اولیں منزل ہے۔ یہ تو اس کا گہوارہ ہے۔ اسے ابھی بہت سی ارتقائی منزل طے کرنی ہیں

یکے در معنیٔ آدم نگر از من چہ می پرسی — ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے
چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے — کہ یزداں را دل از تاثیر او پرخوں شود روزے

قرآن کریم نے یہ بتایا کہ خاک کے ذروں کا معراج کمال یہ تھا کہ وہ انسان بن جائیں۔ لیکن معراجِ انسانیت کیلئے تو ابھی ہزاروں دُنیائیں اور باقی ہیں۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں — یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالم رنگ و بُو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا — کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

انسان نے اس حیات ارضی سے بلند و بالا۔ اس ہیولیٰ مادی سے نفیس و لطیف اور اس محبسِ عناصر سے

ارفع و اعلیٰ زندگی بسر کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرتی ہے۔ وہ اعمالِ حیات جو اس کے اندر اس منزل سے اگلی منزل۔ سلسلۂ ارتقاء کی اگلی کڑی۔ کی زندگی بسر کرنے کی صلاحیت پیدا کر دیں۔ قرآنی اصطلاح میں اعمالِ صالحہ کہلاتے ہیں۔ یہ صلاحیت جس سے انسان اگلی زندگی بسر کرنے قابل ہو جائے۔ بہت بڑی کامیابی اور حصولِ مقصد ہے۔ اسی کا نام فلاح و فوز ہے۔ یعنی مقصد پیشِ نظر میں کامیابی (Success) موجودہ زندگی سے برتر اور فائق۔ منزلِ حیات کا حصول۔ (Achievement) وہ مقام جس میں انکی حالت اصلح (The Fittest) ہو جائے (۴۷/۲) اس اگلی منزل کا نام حیات آخروی اور اس میں فلاح اور فوز کی زندگی کا نام جنت کی زندگی ہے۔ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ۔ (۵۹/۲۰)

آگے بڑھنے سے پیشتر ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ نظریہ تناسخ نہ صرف اس لئے غلط ہے کہ اس میں حیات کے لئے رجعت و تکرار کو ضروری ماننا پڑتا ہے بلکہ اس لئے بھی کہ اس میں انسان سے اختیار و ارادہ کا جوہر سلب کر لیا جاتا ہے۔ جو اسکی انسانیت کی امتیازی خصوصیت ہے۔ آپ جب یہ تسلیم کر لیں کہ ایک شخص شودر کے گھر میں پیدا اس لئے ہوا ہے کہ وہ اپنے کسی گذشتہ جنم کے گناہوں کی سزا بھگتے تو اس کے لئے ان تکالیف و مصائب کے ازالہ یا اس جہالت و نکبت کی زندگی سے مخلصی حاصل کرنیکی تمام کوششیں، بلکہ آرزوئیں۔ بیکار ہیں۔ اس کو یہ اختیار ہی حاصل نہیں کہ وہ اس سزا کی مدت میں کمی یا اسکی سختی میں تخفیف کر سکے۔ باقی رہی سوسائٹی۔ سو اگر وہ شودر کی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کرتی ہے تو اُن کا یہ فعل "خدا" کے فیصلہ کے خلاف ہے۔ برہما اسے اپنے پاؤں سے اس لئے پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کی سزا بھگتے اور آپ اسے برہما کے سر سے پیدا شدہ برہمن کے برابر کر دینا چاہتے ہیں۔ جیل خانہ کے کسی قیدی کو اسکی مدتِ قید سے پہلے جیل خانہ سے بھگا لے جائیے۔ یا جیلخانہ کے قواعد کے خلاف اس کی حالت کو بہتر بنانے اور اسے آسانیاں مہیا کرنے کی کوشش کیجئے۔ پھر دیکھئے کہ ملزم کو جیلخانے میں بھیجنے والی قوتیں آپکے ساتھ کیا برتاؤ کرتی ہیں۔ اور اگر آپ یہ مانتے ہیں کہ برہما کی قوتیں آپ کی قوت سے بڑھ کر ہیں تو آپ کی یہ کوششیں کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتیں۔ آپ کو قطعاً یہ اختیار حاصل نہیں کہ جسے برہما سزا دے اسکی سزا میں تخفیف کر سکیں۔ لہٰذا اس عقیدہ کی رُو سے اس فرد متعلقہ اور افراد سوسائٹی کے اختیار و ارادہ کی قوتیں سلب ہو جاتی ہیں اور جب انسان سے اختیار و ارادہ چھین لیا جائے تو پھر جوہر انسانیت

میں سے اس کے لئے باقی کیا رہ جاتا ہے؟ پھر یہ بھی تماشا ہے کہ آپ اس انسان کا اختیار و ارادہ تو سلب کر لیتے ہیں اور اس سے تقاضا کرتے ہیں کہ وہ اپنی آئندہ جنم کے لئے اپنی حالت کو سدھارنے کی کوشش کرے۔ کوشش تو اختیار و ارادہ کو بروئے کار لانے کا نام ہے۔ جس کی یہ قوتیں سلب ہو چکی ہوں وہ کوشش کیا خاک کر سکے گا؟

پھر عیسائیوں کا نظریہ کہ ہر بچہ آدم و حوّا کے گناہ کا بوجھ اپنے ساتھ لاتا ہے۔ انسان کے اختیار و ارادہ کو سلب کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں نجات کا مدار اعمال نہیں۔ بلکہ کفّارہ کا عقیدہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ بھی محض خوش فہمی کی حیثیت رکھتا ہے۔ علم و بصیرت کی کسوٹی پر ایک ثانیہ کے لئے پورا نہیں اُتر سکتا۔ ایک فرد کی قربانی نوعِ انسانی میں بقا (Survival) اور عروج (Evolution) کی استعداد کیسے پیدا کر سکتی ہے یہ تو اُن کے اپنے جوہرِ ذاتی کے استحکام سے ہو سکے گا اور یہ چیز اعمال کے بغیر کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

ہاں! تو بات یہاں تک پہنچی تھی کہ قرآنی نظریۂ ارتقا کی رُو سے انسان اس دُنیا میں ایک سادہ لوح لیکر آیا ہے۔ کارگہِ حیات میں اُسے اختیار و ارادہ دیکر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ کشمکشِ زندگی کا مقابلہ کرے۔ اسے ایک مکمل نظامِ حیات سے آگاہ کر دیا گیا ہے۔ جس کے تابع رہ کر وہ اس کشمکش میں پورا اُترے اور اس طرح اپنے جوہرِ خودی میں وہ استحکام پیدا کر لے جو اسے اس سلسلہ کی اگلی کڑی میں فلاح و فوز کی زندگی بسر کرنے کے قابل بنا دے اس نظام کا نام ہے ایمان۔ اور وہ ضابطہ جو اس کے اعمال میں ایسی صلاحیت پیدا کر دے۔ قرآنِ کریم ہے۔

اب یہ دیکھئے کہ جسے اعمال کی سزا کہا جاتا ہے اس سے مفہوم کیا ہے۔ سزائیں تین قسم کی ہو سکتی ہے۔ اول انتقامی مثلاً آپ کو کسی نے گالی دی۔ آپ نے غصّہ میں آکر اُسے تھپڑ رسید کر دیا۔ اُسے اپنے کئے کی سزا مل گئی۔ آپ نے انتقام لے لیا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے تو مل نہیں سکتی۔ وہ ذاتِ صمدیت، غصّہ اور اُس کے انتقام کے جذبات سے بلند و بالا ہے۔ ہم اگر گناہ کرتے ہیں تو اس کا کیا بگڑتا ہے جو اُسے (معاذ اللہ) غصّہ آجائے اور اُس کے انتقام میں ہمیں سزا دے۔

سزا کی دوسری قسم تادیبی ہو سکتی ہے۔ ایک شخص نے چوری کی۔ حکومت نے اُسے جیلخانے بھجوا دیا تاکہ قید و بند کی صعوبات سے اُسے اس امر کا سبق ملجائے کہ ایسے جُرم کے عواقب یہ ہوتے ہیں اور یوں وہ خود۔ اور دوسرے دیکھنے اور سُننے والے آئندہ کے لئے جرائم سے مجتنب رہیں۔ ظاہر ہے کہ حیاتِ اُخروی

میں اس قسم کی سزا بھی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ وہ دنیا دار الجزا ہے۔ دار العمل نہیں۔ نہ وہاں سزا کے مقام میں اعمال کی گنجائش۔ نہ اس دنیا میں واپسی کا امکان۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس حقیقت کی تصریح فرمائی گئی ہے کہ اہل جہنم چلائیں گے۔ گڑگڑائیں گے کہ ہمیں ایک مرتبہ پھر سے اسی دار العمل (یعنی پہلی زندگی) میں لوٹا دیا جائے پھر دیکھئے کہ ہم کس طرح جرائم سے اجتناب کرتے ہیں۔ لیکن جواب ملیگا کہ اب وہ زمانہ ختم ہو گیا۔ اب تو یہیں رہنا ہوگا۔ اس لئے کہ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ حیات میں نہ رجعت ہے نہ تکرار۔ سلسلۂ ارتقاء میں یا تو آگے بڑھ جانا ہے یا رک جانا۔ لہٰذا سزا کی دوسری شکل بھی درست نہیں۔

سزا کی تیسری صورت، اعمال کا فطری نتیجہ ہے۔ آگ میں ہاتھ ڈالئے۔ اس کا فطری نتیجہ جل جانا ہوگا۔ زہر کا فطری نتیجہ ہلاکت ہوگا۔ اس لئے اعمال کی جزا و سزا اُن کے فطری نتائج کی ترتیب کا ظہور ہے۔ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (تمہیں وہی بدلہ دیا جائے گا جو تم نے کیا تھا) اس نظریہ کے ماتحت، تمام وہ اعمال جو فطرتِ انسانی کے مطابق ہونگے۔ انسان کے اندر وہ صلاحیت پیدا کرتے جائیں گے جس سے اُسکی رُوح میں بالیدگی اور خودی میں استحکام آتا جائے گا۔ اور اس طرح یہ سلسلۂ ارتقا کی اگلی کڑی میں اس زندگی سے ارفع و اعلیٰ زندگی بسر کرنے کے اہل ہو جائیگا۔ یہ اعمالِ صالحہ کا فطری نتیجہ ہے۔ اس کے برعکس، جس سے ایسے اعمال سرزد نہ ہونگے جو اس کے اندر یہ صلاحیت پیدا کر سکیں۔ (یعنی وہ اعمالِ غیر صالح ہونگے) اس کے اندر ضعف و پستی پیدا ہوتی جائیگی جس کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اس سے بلند سطح کی زندگی کا اہل نہ رہیگا۔ یہ اعمالِ غیر صالح کی سزا ہے۔

یہاں ایک ضروری نکتہ کی طرف ضمنی التفات کی ضرورت ہے۔ اعمال وہی صالح ہو سکیں گے جو اس نظام کے ماتحت سرزد ہوں جو فطرتِ انسانی میں عروج و ارتقا پیدا کرنے کے لئے خلّاقِ فطرت کی طرف سے متعین ہوا ہے۔ اگر نظامِ زندگی غیر فطری خطوط پر متشکل ہے تو اعمال۔ خواہ وہ آپ کی نگاہوں میں کیسے ہی حسین و مزین کیوں نہ ہوں وہ نتائج کبھی پیدا نہ کر سکیں گے جن سے انسانی فطرت میں بالیدگی اور ترفع کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔ مثلاً ایک شخص کا جسمانی نظام خراب ہو چکا ہے۔ معدہ کمزور ہے۔ جگر خراب ہے۔ خون میں فساد ہے۔ آپ اسے لاکھ مقوی غذائیں کھلائیں خاک اثر نہیں ہوگا۔ غذا اپنا صحیح (فطری) اثر اسی وقت پیدا کریگی جب کھانے والے کا نظامِ جسمانی درست ہوگا۔ اسی طرح اعمالِ انسانی اسی وقت صالح نتائج پیدا کرینگے۔ جب انسانیت کا نظامِ زندگی فطرت کے خطوط پر متشکل ہوگا۔ قرآن کریم یہی نظام پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے وہ افراد کے اعمال میں فطری صلاحیت پیدا کرنے کے لئے ان کے اجتماعی نظام کی اصلاح مقدم قرار

دیتا ہے۔ اور یہ فطری نظام صرف اس اجتماعیت کی زندگی میں پیدا ہو سکتا ہے۔ جسے حکومت الٰہیہ کہا جاتا ہے۔

اور یہ بیان کیا جا رہا تھا کہ اعمال صالحہ کا فطری نتیجہ (جزا) یہ ہے کہ وہ انسان کے اندر اس زندگی سے اگلی (ارفع و اعلیٰ) زندگی بسر کرنے کی صلاحیت پیدا کر دیتے ہیں۔ اسے ایک مثال سے واضح کیا جا سکتا ہے ایک طالب العلم دسویں جماعت میں تعلیم پا رہا ہے۔ اس جماعت کے لیے ایک خاص نصاب متعین ہے۔ وقت مقرر ہے وہ اُن تمام آئین وضوابط سے آگاہ ہے۔ سال بھر محنت کرنے کے بعد وہ امتحان میں شریک ہوتا ہے۔ امتحان کیا ہے؟ اس بات کا جائزہ کہ کیا اس طالب العلم میں اتنی صلاحیت پیدا ہو چکی ہے کہ اسے ایف۔ اے۔ میں ترقی دیدی جائے! اگر اس میں اتنی استعداد پیدا ہو چکی ہے تو اس استعداد کا فطری نتیجہ اس کی ترقی (Promotion) ہے۔ اگر اتنی استعداد پیدا نہیں ہوئی تو وہ اگلی جماعت (اونچے درجہ) میں چڑھایا نہیں جائیگا۔ اسکی عدم استعداد کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ اُسکی ترقی رُک جائے۔ فرق یہ ہے کہ یہاں اس طالب العلم کو دوسرا موقعہ (Chance) بھی مل سکتا ہے کہ وہ پھر محنت کر کے اپنے اندر مطلوبہ استعداد پیدا کر لے اور دوسرے سال امتحان میں بیٹھ جائے۔ لیکن قانونِ مشیت میں دوسرا موقعہ (Chance) نہیں دیا جاتا۔ دنیاوی زندگی ایک ہی مرتبہ ہے۔ دوسری مرتبہ نہیں۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ امتحان میں پاس ہونے کے لئے کئی ایک شرائط ہیں۔ سب سے مقدم یہ کہ آپ اس یونیورسٹی میں داخلہ (Admission) حاصل کر لیں جس کا آپ نے امتحان دینا ہے۔ اس "داخلہ" کا نام قرآنی اصطلاح میں ایمان ہے۔ اگر آپ نے داخلہ (Admission) حاصل نہیں کیا تو آپ امتحان میں نہیں بیٹھ سکیں گے۔ آپکی استعداد کو کسی میزان میں تولا ہی نہیں جائیگا۔ اس لئے کہ جس یونیورسٹی پر آپ کو اعتماد نہیں اُسکے آئین وضوابط کی آپ پابندی کیا کرینگے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنکے متعلق فرمایا۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا
نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا ۝ 18/105

یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیات اور اس کے حضور جانے سے انکار کیا۔ پس اُن کے اعمال رائگاں گئے۔ اُن کے لئے قیامت کے دن میزان بھی نہیں کھڑی کی جائیگی۔

دوسری شرط یہ ہے کہ آپ امتحان کی تیاری اس نصاب کے مطابق کریں۔ جو اس غرض کے لئے یونیورسٹی

کی طرف سے متعین کیا گیا ہے۔ اگر آپ نصاب کی درسی کتابوں کے بجائے دوسری کتابوں میں دماغ سوزی کرتے رہیں گے تو آپ کی محنت اکارت جائیگی۔

اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝ ۱۰۴/۱۸ (اُوپر کی آیت سے پہلی آیت)

وہ جنکی ساری کوششیں دنیا کی زندگی میں کھوئی گئیں اور وہ اس دھوکے میں پڑے ہیں کہ بڑا اچھا کارخانہ بنا رہے ہیں

یہ نصاب، جس کی رُو سے تیاری طالب العلم میں وہ استعداد پیدا کر دیگی کہ اُسے اگلے درجہ میں ترقی دے دیجائے، قرآن کریم ہے خدائی یونیورسٹی نے اسکے علاوہ اور سب نصاب منسوخ کر دیئے ہیں۔ پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ نصاب میں بعض مضامین اختیاری (Optional) ہوتے ہیں اور بعض لازمی (Compulsory) یعنی فرعی اور اُصولی۔ اختیاری (فرعی) مضامین میں اگر آپ سو فیصدی نمبر حاصل کر لیں لیکن کسی ایک لازمی مضمون میں فیل ہو جائیں تو بھی آپ کو ترقی نہیں ملے گی۔ اس امر کا فیصلہ یونیورسٹی سے ہی متعلق ہے کہ کون کون سے مضامین ایسے ہیں جن میں پاس ہونا لازمی ہے۔ خدائی یونیورسٹی کے نصاب (Syllabus) یعنی قرآن کریم میں ان اُمور کی بھی صراحت کر دی گئی ہے۔ پھر بنیادی سوال کہ اگلے درجہ میں ترقی دینے کے لئے کتنے فیصدی نمبروں کا حصول ضروری ہے۔ اس کا فیصلہ بھی یونیورسٹی ہی کرتی ہے۔ قرآنی اصطلاح میں اسے مشیّتِ خداوندی کہتے ہیں (یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَاءُ وَ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَاءُ) یعنی امتحان میں داخلہ کی شرائط کیا ہوں۔ نصاب کون سا رکھا جائے۔ کون کون سے مضامین لازمی ہونگے۔ کس سوال کے لئے کتنے نمبر ہونگے۔ کتنے فیصدی نمبر (Pass-Marks) مقرر کئے جائیں گے۔ ان تمام اُمور کا فیصلہ مشیّت پر موقوف ہے۔ طالب العلم کا کام مشیّت (یونیورسٹی) کے ان قواعد و ضوابط کے مطابق محنت کرنا ہے۔ نکتہ چینی کرنا نہیں ہے۔

سب سے اہم شے کامیابی کے لئے نمبروں (Pass-Marks) کا سوال ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر یونیورسٹی نے کامیابی کے لئے ساٹھ فیصدی نمبر مقرر کئے ہیں تو جس طالب العلم نے ساٹھ نمبر حاصل کئے ہیں اُسکی چالیس نمبروں کی غلطیاں بھی تو ہیں۔ اسے ان چالیس نمبروں کی غلطیوں کے لئے پچھلی جماعت میں

نہیں روکا جاتا۔ بلکہ ترقی دیدی جاتی ہے۔ یعنی اس کی کمزوریاں اس کی صلاحیت واستعداد کے نیچے چھپ جاتی ہیں اس کا نام مغفرت ہے۔ اسی طرح جس طالب العلم نے ساٹھ نمبر کا پرچہ غلط کیا ہے۔ اُس نے چالیس نمبر کا صحیح بھی تو کیا ہے۔ لیکن اسے ان چالیس نمبروں کے عوض ترقی نہیں دیجائیگی اس سئے کمزوری (عدم استعداد) صلاحیت سے بڑھی ہوئی ہے۔ یہ طالب العلم اگلے درجے میں چلنے کے قابل نہیں ہے۔ اس سئے کہ قانونِ ارتقاء میں آگے وہی بڑھ سکتا ہے۔ جسکی صلاحیت وتقویت۔ کمزوری پر غالب آچکی ہو۔ اس طالب العلم کے چالیس نمبر اُسے پاس نہیں کرا سکتے۔ لہذہ پاس یا فیل (یعنی مدارج ارتقاء میں اگلی منزل میں پہنچ جانے یا رُک جانے) کا معیار صلاحیت کے پلڑے کا وزنی یا ہلکا پن ہے

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ۝ ۲۳/۱۰۲-۱۰۳

(اُس دن) جن لوگوں (کے نیک اعمال) کا پلّہ بھاری نکلا بس وہی ہیں جو کامیاب ہونگے اور جن کا پلّہ ہلکا ہوا۔ تو وہی ہیں جنھوں نے اپنے کو بربادی میں ڈالدیا۔ ہمیشہ جہنم میں رہنے والے۔

دیکھئے یہ نہیں کہا گیا کہ جنّت میں وہی داخل ہوگا جس کی کوئی بُرائی نہ ہوگی (یعنی جسنے سو فیصدی نمبر حاصل کئے ہونگے۔) یا جہنّم میں وہ جائیگا جس کی کوئی نیکی نہ ہوگی۔ بلکہ جنت اور دوزخ کا معیار پلّے کے بھاری اور ہلکا ہونا بتایا گیا ہے۔ ممتحن کے سامنے سارا پرچہ ہوگا۔ ادنیٰ سے ادنیٰ صحیح جواب کے نمبر الگ ملیں گے اور ایک ایک غلطی کے نمبر الگ وضع کئے جائیں گے۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ ۹۹/۷-۸

اس کے بعد نمبروں کی میزان ہوگی۔ جسکے صحیح جوابات کے نمبر مشیت ایزدی کے قانون کے مطابق زیادہ ہونگے اُسے ترقی دیدی جائیگی (فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۱۰۱/۶-۷) جس کی غلطیوں کی تعداد زیادہ ہوگی اُسے روک دیا جائیگا۔ (وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝ ۱۰۱/۸-۹) جسکے اعمالِ صالح کا پلڑا بھاری ہوگا اُسے لغزشوں اور کوتاہیوں کی بادا‌ش کے لئے جہنم میں نہیں بھیجا جائیگا (اُسے اگلی جماعت میں بھیجدیا جائے گا) اُسکی نیکیاں (صلاحیت) کمزوریوں کو اپنے نیچے دبا لینگی۔ لازمی مضامین میں پاس ہونے والے کی اختیاری مضامین کی کوتاہیاں

معاف کردی جاتی ہیں۔

وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۴/۶۴

اور جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور عمل صالح کرتا ہے تو اللہ اس کی کوتاہیوں کو اس سے دور کردے گا اور اسے ان باغات میں داخل کردیگا جن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی (جن کی شادابی میں فرق نہیں آئے گا) وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ بہت بڑی فیروزمندی (Achievement) ہے۔

دوسری مقام پر ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰي مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ۴/۴۷

اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اعمال صالح کئے اور ایمان لائے اس (کتاب مبین) پر جو محمد پر نازل کی گئی ہے اور وہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے۔ تو اللہ ان کی کوتاہیوں کو ان سے دور کردیگا اور ان کی حالت کو بہتر بنا دے گا۔

سورہ نساء میں ہے

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَاۗىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ۴/۳۱

جن بڑی بڑی برائیوں سے تمہیں روک دیا گیا ہے اگر تم ان سے بچتے رہو گے تو ہم تمہاری لغزشوں کے اثرات تم سے محو کردیں گے اور تمہیں ایک ایسے مقام پر پہنچا دیں گے جو عزت کا مقام ہوگا

یہ ہیں آگے بڑھنے والے۔ ان کے برعکس جنہیں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہ ہوگی (اعمال غیر صالح زیادہ ہوں گے) وہ جہنم میں رہیں گے اور کبھی آگے نہیں بڑھ سکیں گے کہ وہاں صلاحیت پیدا کرنے کا موقع ہی نہیں ہوگا۔ اس لئے جہنم میں قیام ابدی ہے۔ یہ نہیں کہ جہنم میں جانے والے جب اپنے گناہوں کے مطابق سزا بھگت لیں گے تو پھر انھیں جنت میں منتقل کردیا جائے گا۔ منتقل کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس لئے

کہ جزا اور سزا مشیت کے قانونِ ارتقاء کے مطابق متعین ہوتی ہے۔ جہنم میں بھیجا ہی اسے جائیگا جس میں جنت کی زندگی بسر کرنے کی صلاحیت نہ ہوگی۔ جس میں صلاحیت پیدا ہو چکی ہوگی وہ سیدھا جنت میں چلا جائے گا۔ یہ فیصلہ عین اصولِ فطرت کے مطابق ہے۔ اس لئے قرآن کریم میں متعدد مقامات پر صراحت سے موجود ہے کہ جہنم کی زندگی دوامی ہے۔ وہاں سے نکلنا ناممکن ہوگا

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۝ ۷۲/۲۳

اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کریگا تو اس کے لئے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیگا۔

دوسری مقام پر ہے

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝ ۵/۳۷

وہ چاہیں گے کہ جہنم سے نکلیں مگر نکل نہ سکیں گے اور ان کو دائمی عذاب ہوگا

اس کے برعکس قرآن کریم میں کوئی ایک آیت بھی ایسی نہیں جس سے یہ ثابت ہو کہ کسی کو جہنم میں سزا بھگتنے کے بعد جنت کی طرف منتقل کیا جائے گا اور جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے منتقل کرنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ بعض حضرات جہنم کو ہسپتال قرار دیتے ہیں جس میں مریض داخل ہونگے اور شفایاب ہونے کے بعد خارج کر کے جنت میں داخل کر دئیے جائینگے۔ یہ تصور بھی قرآن کریم کے نظریۂ نجات کو نظر انداز کر دینے سے پیدا ہوتا ہے۔ ذرا سوچئے کہ شفا کسے کہتے ہیں۔ مثلاً صبح کے وقت ایک شخص کا درجہ حرارت اعتدال پر ہے۔ دوپہر کو اسے بخار ہو جاتا ہے۔ اور درجۂ حرارت ایک سو تین تک جا پہنچتا ہے۔ پہلی حالت صحت کی اور دوسری حالت بیماری کی ہے۔ اس کا علاج کیا جاتا ہے اور دوسری صبح اسکا درجہ حرارت پھر اعتدال پر آجاتا ہے۔ ایک دن اور احتیاط کی جاتی ہے تو اس کی کھوئی ہوئی طاقت عود کر آتی ہے اور تیسری صبح وہ پھر اسی حالت میں آجاتا ہے جس میں صحت کے عالم میں تھا۔ غور فرمائیے اس دوران میں کیا تبدیلی ہوئی۔ پہلی حالت صحت کی تھی۔ دوسری بیماری کی۔ تیسری صبح پھر وہی حالت آگئی جو مرض سے پہلے تھی۔ اسے شفا کہتے ہیں یعنی مریض کا اپنی پہلی حالت کی طرف عود کر آنا۔ ظاہر ہے کہ اس میں عروج اور ترقی کا کوئی شائبہ نہیں اس میں حیات (Life) کی حرکت ارتقائی نہیں بلکہ دَوری تسلیم کرنی پڑتی ہے۔ اور یہ وہی تصور ہے جس پر نظریۂ تناسخ کی بنیاد قائم ہے۔ فرق اتنا ہے کہ تناسخ میں انسان کو گناہوں

کی آلائشوں (امراض) سے پاک وصاف (شفایاب) کرنے کے لئے پھر سے اسی دُنیا میں لانا پڑتا ہے اور جہنم کو ہسپتال سمجھنے کی صورت میں اُسے اس دُنیا کی بجائے حیات اُخروی میں لے جاتے ہیں۔ اگر غور کیجئے تو ایک صورت میں نظریۂ تناسخ اس نظریہ سے زیادہ وزنی ہو جاتا ہے یعنی نظریہ تناسخ کے ماننے والے انسان کو پھر اس دنیا میں واپس لاتے ہیں جہاں (بقول اُنکے) عمل کی گنجائش ہے لیکن جہنم کو ہسپتال سمجھنے میں انسان کو گناہوں کی کثافتوں سے پاک وصاف کرنے کے لئے ایسے مقام میں رکھا جاتا ہے جہاں (اُن کا خود عقیدہ ہے کہ) عمل کی گنجائش نہیں۔ آپ ان تمام نظریات پر غور کرینگے تو ان میں ایک اُصول بطور قدر مشترک پائیں گے۔ یعنی یہ اُصول کہ انسانی زندگی کا منتہیٰ یہ ہے کہ انسان اس دُنیا میں آنے سے پہلے جس حالت میں تھا۔ پھر سے اُسی قسم کی حالت پیدا کرلے۔ اگر دُنیاوی زندگی کی کشمکش میں وہ گناہوں سے آلودہ ہو گیا ہے تو اس آلودگی کو دُور کرنے کے لئے یا اُسے اس دُنیا میں بار بار بھیج دیا جائے اور یا جہنم کی بھٹی پر چڑھا کر ان دھبوں کو دور کر دیا جائے لیکن جیسا کہ اس مضمون کے شروع میں لکھا جا چکا ہے۔ انسانی زندگی کا یہ منتہیٰ ہی غلط ہے۔ حیات ارتقائی منازل میں سے گذر رہی ہے۔ انسان نے جس حالت میں دُنیا میں قدم رکھا ہے۔ حیات اُخروی (جنت کی زندگی) میں وہ اُس حالت سے ایک قدم آگے ہوگا کہ عروج و ارتقاء کا یہی تقاضا ہے۔ اُسی حالت میں رہنا تو جمود و تعطل ہے اس اعتبار سے تو انسان سے پتھر بہتر ہے کہ جس حالت میں پیدا ہوتا ہے اُسی میں عمر گذار دیتا ہے۔ اور اگر یہ صحیح ہے کہ پتھر سے اس دُنیا کا انسان بہتر ہے۔ کیونکہ یہ میدانِ ارتقاء میں اُس سے کئی منازل آگے ہے تو اس دنیا میں آنیوالے انسان سے حیاتِ اُخروی (جنت کی زندگی) کے انسان کو بھی آگے ہونا چاہیئے۔ یہی قرآنی نظریۂ نجات ہے۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس دُنیا میں بھی تو اعمال کی جزا و سزا ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ جو محنت کرتا ہے اُس کا پھل پاتا ہے جو غفلت برتتا ہے اُس کا خمیازہ بھگتتا ہے۔ یہ بالکل درست ہے۔ دُنیا کا نظام ہی اسپر چل رہا ہے۔ قرآن کریم خود ہمیں بتاتا ہے کہ

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ
وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ ۹۷

جس کسی نے اچھا کام کیا۔ خواہ مرد ہو خواہ عورت۔ اور وہ ایمان بھی رکھتا ہو تو ہم اسے ضرور

اچھی زندگی بسر کرائیں گے اور انھوں نے جیسے جیسے اچھے کام کئے ہیں اسی کے مطابق ہمارا اجر ہوگا

اس دنیا میں حیات طیبہ اور آخرت کی زندگی میں بھی سرفرازی و سربلندی

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ط وَ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ط وَ لَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ۝ ۱۶/۳۰

جن لوگوں نے اچھے کام کئے اُن کے لئے اس دُنیا میں بھی اچھائی ہے اور آخرت کا گھر بھی خیر و برکت کا گھر ہے۔ پس متقیوں کا کیا ہی اچھا ٹھکانہ ہے۔

اس کے برعکس اعمالِ غیر صالح کا نتیجہ اس دُنیا کی ذلت و رسوائی ہے

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ لَا هُدًى وَّ لَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّ نُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝ ۲۲/۸-۹

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ نہ تو اُن کے پاس علم ہے نہ ہدایت نہ روشن کتاب لیکن نہایت تکبر سے اللہ کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو اس کی راہ سے بھٹکا دیں ایسے آدمی کے لئے دنیا کی زندگی میں بھی رُسوائی ہے اور قیامت کے دن ہم اُسے عذاب آتش کا مزہ چکھائینگے

لیکن چونکہ حیات (Life) میں تسلسل (Continuity) ہے اس لئے مکافاتِ عمل کا سلسلہ اسی دُنیا میں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ جیسا کہ اُوپر کی آیات سے واضح ہے۔ آگے بھی چلتا ہے بلکہ یوں کہئے کہ نتائجِ اعمال کے مکمل مظاہرہ کا وقت تو حیاتِ اُخروی میں ہی ہے۔ اعمال اور اُن کے نتائج میں وقفہ ضروری ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّ لٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى ج فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝ ۱۶/۶۱

اور اگر ایسا ہوتا کہ اللہ لوگوں کو ان کے ظلم پر (فوراً) پکڑتا تو ممکن نہ تھا کہ زمین کی سطح پر کوئی حرکت کرنیوالی ہستی باقی رہتی۔ لیکن وہ انھیں ایک خاص ٹھہرائے ہوئے وقت تک مہلت دیتا ہے۔ پھر جب وہ وقتِ مقررہ آپہنچا تو نہ تو ایک گھڑی پیچھے رہ سکتے ہیں نہ آگے

انسان کی نگاہیں چونکہ اسی زندگی کی چار دیواری میں گھری ہوئی ہیں اس لئے وہ مکافاتِ عمل کو بھی اسی

چار دیواری میں محدود سمجھتا ہے۔ حالانکہ عمل اور اس کے نتیجہ کے درمیانی وقفہ کے لئے دنیا کی چار دیواری کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ اس کا تعلق حیات سے ہے۔ فطرت کا قانون ہے کہ کوئی عمل بلا نتیجہ نہیں رہ سکتا۔

وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ ۴۵/۲۲

اور اللہ نے زمین اور آسمان کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے یعنی اس لئے کہ ہر ایک (نفس) کو اس کے اعمال (کمائی) کا بدلہ دیا جائے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

آپ اس دنیا پر ذرا غائر نگاہ ڈالئے۔ یہاں ہر شے مادیت کی چار دیواری یعنی قوانینِ طبعی کے حدود و قیود میں گھری ہوئی ہے۔ اس لئے یہاں اعمال کے نتائج برآمد ہونے کے لئے مادی اسباب اور طبعی ذرائع کی ضرورت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اعمال کے یہ نتائج بھی قوانینِ مشیت کے تابع ہی مرتب ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بھی مشیت ہی نے مقدر کر رکھا ہے کہ ان کے نتائج مادی اسباب و نظام کے ماتحت مرتب ہوں۔ مثلاً حق میں بڑی قوت ہے۔ لیکن اس قوت کو مؤثر بنانے یا بروئے کار لانے کے لئے شمشیرِ خاراشگاف کی بھی ضرورت ہے۔ قرآن کریم نے ایمان و اعمال صالح کا فطری نتیجہ استخلاف فی الارض قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ ۸/۵۹

اور (مسلمانو) جہاں تک تمہارے بس میں ہو قوت پیدا کرکے اور گھوڑے تیار رکھ کر دشمنوں کے مقابلہ کے لئے اپنا ساز و سامان مہیا کئے رہو کہ اس طرح مستعد رہ کر تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں پر دھاک بٹھائے رکھو گے۔

اس لئے کہ مادیت کی چار دیواری میں گھری ہوئی دنیا میں اعمال کے نتائج مادی ذرائع سے مادی پیکروں میں ہی نمودار ہوں گے۔ اس حد تک تو مومن و کافر برابر ہیں ایک مادہ پرست قوم اگر ایسے ذرائع مہیا کرے گی تو اس کے ہاتھ میں بھی سلطنت اسی طرح آجائیگی جس طرح ایک خدا پرست[1] قوم کے ہاتھ میں۔ لیکن فرق اس

---

[1] خدا پرست قوم کے ساتھ خدا کی نصرت بھی ضرور ہے۔ لیکن اس نصرت کے لئے اپنی تیاری بھی ضروری ہے سو پر غالب آنے کے لئے دس مومنین کی موجودگی ضروری ہے۔

سے آگے جاکر شروع ہوگا۔ وہ خدا نا آشنا قوم اس قوت و سلطنت کو اپنی اغراض کے لئے استعمال کریگی۔ اس سے وہ دُنیاوی فوائد سے تو متمتع ہوتی جائیگی۔ لیکن وہ جوہرِ خودی۔ وہ نورِ انسانیت جس نے اپنے اندر وہ صلاحیت پیدا کرنی تھی کہ وہ اس زندگی سے ارفع و اعلےٰ زندگی بسر کر سکے۔ اس میں ضعف و سقم پیدا ہوتا جائیگا۔ جیسے سنکھیا کھانے والے کے خون میں حرارت آجاتی ہے۔ رنگ میں شگرفی پیدا ہو جاتی ہے۔ دیکھنے والا اُسے قوی توانا تصوّر کرتا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ جوہرِ حیات کو آتشِ خاموش کی طرح جلاتا چلا جاتا ہے اور ایک وقت معیّنہ پر جاکر صحت و توانائی کا یہ نظر فریب مجسّمہ راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے برعکس یہی قوت و سلطنت جب جماعت مومنین کے ہاتھ میں آتی ہے تو وہ اُن سے دُنیاوی فوائد سے بھی متمتع ہوتی ہے۔ لیکن اُسکے ساتھ ساتھ چونکہ وہ اس قوت کو نظامِ خداوندی کے تابع رکھتی ہے اس لئے اُن کے جوہرِ خودی میں استحکام اور رُوحِ انسانیت میں بالیدگی پیدا ہوتی جاتی ہے جس سے یہ اگلی زندگی میں ترقی حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں۔ نہ صرف خود ہی پیدا کر لیتے ہیں بلکہ جو بھی اُن کے نظام کے تحت زندگی بسر کرتا ہے اُسمیں بھی یہ جوہر پیدا کرنے کے سامان مہیّا کر دیتے ہیں۔ اب اگر جزا و سزا کی آخری حدیں اسی دُنیاوی زندگی میں ختم ہو جائیں تو قوتِ فرعونی اور شوکتِ موسوی میں کوئی فرق نہ رہے اور اعمال کا وہ حصّہ جس کا تعلق جوہرِ انسانیت یعنی ایمان سے ہے۔ بلا نتیجہ رہ جائے۔ یہ ہیں وہ نتائج جو اس دُنیا میں نگاہوں سے اُوجھل رہتے ہیں۔ لیکن اِس کے بعد کی دُنیا میں اُن کی معنوی حیثیت محسوس پیکر اختیار کر کے سامنے آجائے گی

وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ ۴۵/۳۳

اور اُن کے اعمال کی بُرائیوں (کے نتائج) ان کے سامنے نمودار ہو جائیں گے اور جس چیز کی وہ ہنسی اُڑایا کرتے تھے وہ (شامتِ اعمال) اُنھیں گھیر لیگی۔

اس لئے کہ وہاں انسان کی آنکھوں سے پردے اُٹھ جائیں گے اور اُس کی نگاہوں کے دامن میں بجلیاں بھر دی جائیں گی۔ یہاں اُسکی نگاہیں مادّہ کی چار دیواری میں گھری رہتی ہیں وہاں یہ دیواریں ٹوٹ جائیں گی۔

فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ۝ ۵۰/۲۲

سو ہم نے تیری آنکھوں سے تیرا پردہ اُٹھا دیا اور تیری نگاہیں آج بہت تیز ہو گئیں۔

لہٰذا جو شخص اپنی جد و جہد کو اسی دُنیا کے اغراض و مقاصد (یعنی اپنی طبعی زندگی) تک محدود رکھتا ہے۔ اُسے اُسکی جد و جہد کا صلہ اسی دُنیا میں مِل جاتا ہے۔ اس سے آگے (جوہرِ انسانیت کی بالیدگی۔ یعنی

حیاتِ اُخروی میں) اس کا کوئی حصّہ نہیں ہوتا۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ ۱۱/۱۵-۱۶

جو کوئی صرف دُنیا کی زندگی اور اُس کی زینت و آرائش ہی چاہتا ہے تو ہم یہاں اُس کی کوشش و عمل کے نتائج پورے پورے دیدیتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ دُنیا میں اُس کے ساتھ کمی کیجائے لیکن یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے لئے آخرت کی زندگی میں آگ کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ جو کچھ انھوں نے یہاں بنایا ہے اکارت جائے گا اور جو کچھ کرتے رہے ہیں سب نابود ہو جانے والا ہے۔

اس زندگی کے بعد کی زندگی میں اُن کا کوئی حصّہ نہ ہوگا (لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۔ ہے) کہ اُنکا آخرت پر ایمان نہیں۔ آخرت پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی تگ و دو اور جد و جہد کا مقصد و غایت اسی دُنیا کی کامیابی قرار نہ دے لے بلکہ اُس کا نصب العین اپنے اندر وہ صلاحیت پیدا کرتا ہو جس سے وہ حیاتِ اُخروی میں سرفرازی و سربلندی کی زندگی بسر کر سکے۔ اسی لئے ایک مردِ مومن کی دُعا۔ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً ط (دُنیا میں بھی بہتری اور آخرت میں بھی بہتری) ہے۔ یاد رہے کہ جس کی آخرت بہتر ہے اُسکی یہ دنیا بھی بہتر ہوگی۔ لیکن یہ ضرور نہیں کہ جسکی یہ دُنیا بہتر ہے اُس کی آخرت بھی بہتر ہو۔

چونکہ یہاں ایمان کا لفظ سامنے آگیا ہے۔ اس لئے سر راہے ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ بھی ضروری سمجھا گیا ہے۔ اکثر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک مومن۔ جس کے اعمال صالحہ کا پلڑا ہلکا تھا۔ جہنم میں رہے گا؟ اس سوال سے ایمان و عمل کے باہمی تعلق کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان و عمل ایکدوسرے سے الگ کئے ہی نہیں جا سکتے۔ اعمال فی الاصل ایمان ہی کے مظاہرے کی مختلف شکلیں ہیں۔ مثلاً ایک مومن کی بنائے ایمان یہ ہے کہ خدا کے سوائے کوئی ہستی ایسی نہیں جسکے سامنے جھکا جائے۔ اب دنیا میں جہاں جہاں ایسے مواقع آئیں گے کہ خدا اور غیر خدا میں سے ایک کے سامنے جھکنے کی کشمکش پیدا ہوگی تو اس مردِ مومن کے ایمان کا تقاضا ہوگا کہ وہ صرف خدا کے سامنے جھکے۔ یہ ایک عملِ صالح ہے لیکن درحقیقت اُس کے ایمانِ محکم کا ہی تو مظاہرہ ہے۔ لیکن اگر وہ اس مقام پر خدا کے بجائے غیر خدا کے سامنے جھک گیا تو ہر چند اسکی زبان پر ایمان کے الفاظ ہونگے۔ لیکن درحقیقت اس کا ایمان زندہ نہیں ہوگا۔

مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل

اس لئے ایمان وعمل میں بادل اور پانی کا سا تعلق ہے۔ ہر بادل کو خاص ماحول میں پہنچکر پانی میں تبدیل ہو جانا ہوگا۔ اگر وہ اُس وقت پانی میں تبدیل نہیں ہوتا تو وہ بادل نہیں، دھواں ہے جسپر بادل کا دھوکا ہو گیا تھا اس لئے قرآن کریم میں متعدد مقامات پر مدعیانِ ایمان کے لئے بھی جہنم کی وعید آئی ہے۔ ایک جگہ قتلِ مومن کے متعلق ارشاد ہے۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ۝ ۴/۹۳

اور جو مسلمان کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کر ڈالے تو اُسکی سزا جہنم ہے جہاں وہ ہمیشہ رہیگا اور اس پر اللہ کا غضب ہے اور اُسکی لعنت اور اُس کیلئے خدا نے بہت بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے

سورہ انفال میں دیکھئے۔ بدر کا میدان ہے۔ مومن مجاہدین کی مٹھی بھر جماعت اپنی تمام کائنات خدا کی راہ میں قربان کر دینے کے لئے سربکف میدان میں آگئی ہے۔ دُشمن سامنے ہے اسوقت ارشاد ہوتا ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۝ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ ۸/۱۵+۱۶

مسلمانو! جب کفار کے لشکر سے تمہاری مڈھ بھیڑ ہو جائے تو اُنھیں پیٹھ نہ دکھاؤ۔ اور جو کوئی اُس وقت پیٹھ دکھائے گا تو سمجھ لو کہ وہ خدا کے عذاب میں آگیا اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہوا اور وہ پہنچنے کی کیا ہی بُری جگہ ہے۔ مگر ہاں جو کوئی لڑائی کی مصلحت سے۔ یا اپنی جماعت کے پاس جگہ لینے کے لئے ایسا کرے (تو اُس کا کوئی مضائقہ نہیں)

غور فرمایا آپ نے! کس طرح ایک لازمی مضمون میں فیل ہو جانے سے سب محنت اکارت چلی گئی۔

سورہ آل عمران میں سود سے ممانعت کے ضمن میں فرمایا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝ ۳/۱۲۹-۱۳۰

اے مسلمانو! سود مت کھاؤ جو (اصل سے ملکر) دُگنی چوگنی رقم ہو جاتی ہے۔ اللہ سے ڈرو

(اپنے آپ کو اللہ کی حفاظت میں رکھو) تاکہ تم کامیاب ہو۔ اور اس آگ سے بچو جو کفار کے لئے تیار کی گئی ہے۔

دیکھئے۔ سود خوار مدعیٔ ایمان کے لئے وہی آگ ہے جو کفار (ایمان سے منکر) کے لئے ہے۔ ان نظائر سے آپ نے دیکھ لیا کہ ایمان و عمل کا باہمی کیا تعلق ہے! البتہ اگر سہو و نسیان سے لغزش ہو جائے تو اس لغزش سے توبہ (یعنی اپنی پہلی حالت پر لوٹ آنے) سے وہ سقم دور ہو سکتا ہے جو اس لغزش کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔ بشرطیکہ یہ ندامت اور توبہ اُس وقت ہو جب ابھی بازآفرینی کی گنجائش یعنی اعمال کے مواقع ہوں۔ جس وقت موت سامنے آکھڑی ہو۔ اُس وقت کی توبہ کسی کام نہیں آسکتی۔ کہ اس کے بعد اعمال کے لئے موقعہ ہی نہیں ہوگا تو صلاحیت کی کمی کس طرح پوری ہوگی!

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ اعمالِ انسانی جو اس دُنیا میں معنوی شکل اختیار کئے ہوئے ہیں۔ حیاتِ اُخروی میں اُن کے نتائج محسوس پیکر میں سامنے آجائیں گے۔ صلاحیت کا فطری نتیجہ جنت کی زندگی۔ اور عدم صلاحیت سے دوزخ میں قیام۔ جنت کی آسائش اور جہنم کے آلام کی کیفیت کیا ہوگی! یہ وہ چیزیں ہیں جو آج سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ انسانی زندگی سے پچھلے درجہ کا حیوان نہیں سمجھ سکتا کہ انسانیت کے جوہر امتیازی کیا ہیں۔ اُن کا احساس صرف انسانیت کی منزل میں پہنچکر ہو سکتا ہے۔ اسی طرح انسانیت کی موجودہ منزل سے اگلی منزل کی خصوصیتیں کیا ہیں۔ اُن کا ادراک آج کی منزل میں نہیں ہو سکتا۔ اُس منزل میں پہنچکر ہی ہو سکتا ہے۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ ۳۲/۱۷

سو کوئی شخص (نفس) نہیں جانتا کہ اُن کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لئے کیا پوشیدہ رکھا ہوا ہے۔ اُن کے اعمال کا بدلہ۔

اسی طرح عذاب جہنم کی حقیقت کا ادراک بھی اسی وقت ہو سکے گا جب "پردے اُٹھ جائیں گے اور نگاہیں تیز ہو جائیں گی"۔ وہ عذاب جس کے متعلق فرمایا کہ

نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ ۝ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ ۝ ۱۰۴/۶

اللہ کی سُلگائی ہوئی آگ جو دلوں پر چڑھ آتی ہے۔

وہ حقائق جنکا ادراک آج نہیں ہوسکتا۔ اُن کے لئے ایمان بالغیب ضروری ہے۔ اس لئے نعمائے جنت اور عذاب جہنم کے متعلق آج ہمارا ایمان صحیح ہے کہ اُن کے متعلق قرآن کریم کا ایک ایک لفظ حق ہے۔ اصولی طور پر ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ جنت کی زندگی۔ انسانیت کے سلسلۂ ارتقاء میں اس منزل سے اگلی منزل کا نام ہے اور جہنم اُن کا مقام ہے جو اگلی منزل میں جانے کی صلاحیت اپنے اندر نہ رکھتے ہونگے۔ قرآنی اشارات سے اس امر کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ارتقائی منازل کا یہ سلسلہ جنت سے آگے بھی چلتا رہیگا اور وہاں آگے بڑھنے کے امکانات ہونگے۔ ظاہر ہے کہ زندگی ایک جوئے رواں ہے۔ اُس کا ایک خاص مقصد اور متعین منتہیٰ نہیں ہے۔ انسان کو اپنی ارتقائی منازل طے کرتے کرتے اس منتہیٰ تک پہنچنا ہے۔ یہ منتہیٰ کیا ہے؟ یہ نقطۂ آخری کونسا ہے؟ اسکی حقیقت قرآن کریم سے ابھی سمجھ میں نہیں آسکی۔ شاید اس زندگی میں اسکی تشریح کی ضرورت بھی نہ ہو۔ اس منزل میں تو صرف اتنا بتانے کی ضرورت ہے کہ اس منزل سے اگلی منزل تک پہنچنے کے لئے کیا کرنا ہے۔ اس منزل سے آگے کونسی منزل ہے اور وہاں تک کیسے پہنچا جائیگا۔ یہ وہاں کے بتانیکی باتیں ہیں۔ وہاں پہنچکر زندگی کا مقصد اور اس کی غایت اس درجہ درخشندہ طور پر سامنے آجائیگی کہ اس منزل میں نہ پہنچ سکنے والے آگے بڑھنے والوں کی خوش بختیوں پر اپنے ہاتھ کاٹیں گے اور فرط حسرت سے پکار اٹھیں گے۔ کہ

يَا لَيْتَنِي قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي ۸۹/۲۴

اے کاش۔ میں نے اس اپنی زندگی کے لئے پہلے سے کچھ بھیجا ہوتا

قرآن کریم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُس زندگی میں موجودہ زندگی اور اس کے احوال وظروف کا احساس اور اس کی یاد باقی ہوگی اور یہ ہونا بھی چاہیے۔ حیات (Life) میں وحدت اور تسلسل ہے۔ لیکن اس وحدت میں "میری" اور "تیری" کا امتیاز اس منزل میں شروع ہوا ہے جو انسانی زندگی کہلاتی ہے۔ اور یہ امتیاز اور احساس اُس شعور و ادراک کا خاصّہ ہے جو انسانی زندگی کا امتیازی جوہر ہے۔ اس سے پہلے چونکہ شعور و ادراک نہ تھا اس لئے حیات کے "میری" اور "تیری" ہونے کی تفریق بھی نہ تھی۔ اس تفریق کی ابتدا انسانیت میں آکر ہوئی۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو اپنے مخصوص دلکش و بلیغ انداز میں ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ ۳۲/۵

اللہ اپنے ایک امر (اسکیم) کی تدبیر آسمان سے زمین کی طرف کرتا ہے۔ پھر وہ اسکیم (اپنے ارتقائی منازل طے کرکے) اُس کی طرف بلند ہو جاتی ہے ایک دن (منزل) میں جس کی مقدار تمہاری گنتی کے اعتبار سے ہزار سال ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ ذات جو غیب و حاضر کی جاننے والی زبردست اور رحیم ہے۔

یہ ایک اُصول بیان فرمایا کہ کس طرح اُسکی اسکیمیں ارتقائی منازل طے کرکے تکمیل تک پہنچتی ہیں۔ اس کے بعد فرمایا۔

اَلَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۝ ۳۲/۷

وہ ذات جس نے اپنی مخلوق میں سے ہر شے کو اچھی طرح بنایا اور انسان کی پیدائش کی ابتدا مٹی سے کی۔

تخلیق انسانی کی ابتدائی منزل (جمادات) کا ذکر کرنے کے بعد اس کے حیوانی درجہ کا ذکر فرمایا۔

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝ ۳۲/۸

پھر اس کی نسل کو حقیر پانی کے خلاصہ سے بنایا۔

یہ درجۂ حیوانیت تھا۔ اس کے بعد

ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ ۳۲/۹

پھر اُسے درست کیا۔ اور اُس میں اپنی رُوح پھونکی۔

درجۂ حیوانیت میں تسویہ کے بعد جب اگلی منزل (انسانیت) شروع ہوئی تو اُس وقت ایک امتیازی کیفیت پیدا کردی۔ یہ امتیازی کیفیت ہے "نفس انسانی" (خدا کی رُوح) جس کا خاصہ شعور و ادراک اور اختیار و ارادہ ہے۔ دیکھئے! یہاں تک انسان کا ذکر غائب کے صیغہ (Third Person) میں ہو رہا تھا۔ اس کے بعد فرمایا۔

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ ۳۲/۹

اور اس نے تمہارے لئے سمع (سننا) اور بصر (دیکھنا) اور قلب - بنایا - لیکن تھوڑے (انسان) ایسے ہیں جو ان سے صحیح کام لیتے ہیں (شکر)

نفخ روح (ادراک و شعور عطا کرنے) کے بعد انسان اس قابل ہوگیا کہ اس کا ذکر مخاطب کے صیغہ (Geeond Person) میں کیا جائے - اس شعور و ادراک کی رو سے حیات کی نسبت "میں" اور "تو" سے ہوگئی - اس کے بعد فرمایا -

وَ قَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ؕ بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ۝ ۳۲/۱۰

اور (منکرینِ حیات اُخروی) کہتے ہیں کہ کیا جب ہم زمین میں (ملکر) کھوئے جائیں گے - تو کیا (اس کے بعد) ایک نئی پیدائش میں (اُٹھائے جائیں گے؟) - ہاں! یہ لوگ اپنے رب کے حضور جانے سے انکار کرتے ہیں -

جواب میں فرمایا -

قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ۝ ۳۲/۱۱

(اُن سے کہو - موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے وہ تمہیں وفات دے گا اور اس کے بعد تم اپنے رب کی طرف لوٹو گے -

غور فرمایا آپ نے! اللہ کی اسکیم متعلقہ انسان کہاں سے شروع ہوئی اور کس طرح منزل بہ منزل آگے بڑھتی چلی گئی - اس اسکیم میں - موضوع زیرِ نظر کے اعتبار سے - یہ حصّہ قابلِ غور ہے کہ انسان تخاطب کے قابل اسوقت ہوا جب اُسے شعور و ادراک (ذرائع علم - یعنی سمع و بصر و قلب) عطا ہوئے - حیات کی میں اور تو کا یہی احساس اس کے ساتھ رہیگا - اور آئندہ زندگی میں اور بھی نمایاں ہوجائے گا - اس میں اور تو سے متمیز حیات کو وہاں پیکر کس قسم کا عطا ہوگا - یہ بھی ہم آج نہیں سمجھ سکتے - لیکن پیکر کوئی سا بھی ہو - بہرحال اس زندگی کا احساس ہوگا - اور یہی وہ شدّتِ احساس ہوگی جو اہل جہنم کی زندگی کو اس قدر دردانگیز و کرب آمیز بنا دیگی کہ وہ چلا اُٹھیگا کہ یٰلَیْتَنِیْ كُنْتُ تُرٰبًا - اے کاش میں (ذی حس انسان ہونے کے بجائے بے حس) مٹی ہوتا - شعور و ادراک جوہر انسانیت تھا - اسکی صحیح بالیدگی اور فطرت کے مطابق پرورش[1] - انسان کو

---

[1] شعور و ادراک انسانی کے صحیح استعمال کی پرکھ یہ ہے کہ انسان قرآن کو حقیقتِ ثابتہ مانتا ہے اور اُسے ضابطۂ حیات قرار دیتا ہے یا نہیں

اگلی منزل میں پہنچانے کے قابل بنانے والی تھی۔ جن انسانوں نے اس جوہرِ انسانیت سے کام نہ لیا وہ آگے بڑھنا تو کجا اپنے آپ کو سطحِ انسانیت سے بھی نیچے پائیں گے اور حقیقت یہ ہے کہ جس نے انسان ہوکر جوہرِ انسانیت سے کام نہ لیا اور اسمیں جلا نہ پیدا کی۔ وہ انسان نہیں حیوان ہے۔ بلکہ اس سے بھی گیا گذرا اس لئے قرآن کریم میں اہل جہنم کو کبھی حیوانات (سلسلۂ ارتقا کی پچھلی کڑی) کی صف (Category) میں بتایا گیا ہے۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا۔ وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا۔ وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ۝ ۷/۱۷۹

اُن کے پاس دل ہے لیکن یہ اس سے سمجھ بوجھ کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان ہیں مگر اُن سے سُننے کا کام نہیں لیتے۔ یہ لوگ (ان امتیازاتِ انسانیت کو کھوکر) حیوانوں کی طرح ہو گئے۔ بلکہ اُن سے بھی زیادہ کھوئے ہوئے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو غفلت میں ڈوب گئے۔

اور کبھی اُن کا سلسلہ جمادات کے ساتھ جا ملایا ہے۔ جہاں کہا گیا ہے کہ جہنم کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔ (وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ ۲/۲۴)

کہا یہ جاتا ہے کہ جن انسانوں کو عقل و شعور عطا نہیں ہوا (مثلاً پاگل) اُن کا کیا حشر ہوگا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ان میں۔ اس زندگی سے اگلی زندگی (یعنی سلسلۂ ارتقا کی اگلی منزل۔ جنت) کی زندگی بسر کرنیکی صلاحیت تو پیدا نہیں ہوئی۔ اس لئے وہ اگلی منزل میں تو جا نہیں سکتے۔ اور بلا شعور و ادراک (یعنی اختیار و ارادہ کے بغیر) عذاب نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں کو عذاب کا احساس نہیں ہوگا جیسے یہاں بے حس رہے۔ وہاں بھی بے حس ہونگے۔

قرآن کریم میں جنت اور دوزخ کے علاوہ ایک تیسرے مقام کا بھی ذکر ہے جسے اعراف کہا گیا ہے۔ اعراف ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو زمین سے بلند ہو۔ جنت اور دوزخ والوں کے متعلق فرمایا بَيْنَهُمَا حِجَابٌ (۷/۴۶) ان دونوں کے درمیان ایک اوٹ ہوگی۔ اس کے متعلق دوسری جگہ فرمایا کہ وہ ایک دیوار ہے جس میں ایک دروازہ ہے۔ بَاطِنُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهُ مِن قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۵۷/۱۳ (جس کے اندر رحمت ہے

اور باہر عذاب) یعنی دوزخ اور جنت کے درمیان ایک پردہ یا دیوار کا ہی فاصلہ ہے۔ اُن کی سرحدیں آپس میں ملی ہوئی ہیں۔ ایک قدم آگے بڑھ گئے تو اگلی منزل۔ پیچھے رہ گئے تو پچھلی منزل۔ لیکن اس اوٹ یا دیوار (عند فاصل) پر بھی کچھ لوگ ہونگے۔

وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ ۚ وَنَادَوْا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَمْ يَدْخُلُوهَا وَهُمْ يَطْمَعُونَ ۝ وَإِذَا صُرِفَتْ أَبْصَارُهُمْ تِلْقَاءَ أَصْحَابِ النَّارِ قَالُوا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝ ۴۶-۴۵

اور اعراف (بلندی) پر کچھ لوگ ہونگے جو ہر ایک (اہل جنت و جہنم) کو اُن کی علامتوں سے پہچانتے ہونگے وہ جنتیوں سے پکار کر کہیں گے۔ سلامٌ علیکم۔ وہ ابھی تک اس میں داخل نہیں ہو سکے مگر اسکے آرزومند ہیں۔

اور جب اُن کی نگاہ دوزخیوں کی طرف مڑیگی تو کہیں گے کہ اے ہمارے رب۔ ہم کو اس گنہگار قوم کے ساتھ شامل نہ کرنا۔

قرآن کریم میں اسکی تصریح نہیں کہ اہل اعراف کا انجام کیا ہوگا۔ ماہرین سلسلۂ ارتقاء ہمیں بتاتے ہیں کہ پچھلی منزل اگلی منزل کی طرف تدریجی ترقی کرتے وقت ایک درجہ Stage) ایسا بھی آتا ہے جس میں کچھ خصوصیات پچھلی منزل کی باقی ہوتی ہیں اور کچھ اگلی منزل کی آچکی ہوتی ہیں۔ یہ دونوں منزلوں کے بین بین کا درجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ حکیم ابن مسکویہ[1] نے (جو حکمائے اسلامیہ میں نظریۂ ارتقاء کا محقق ہے) اپنے مشہور رسالہ الفوز الاصغر میں اس درمیانی منزل کے متعلق تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ نباتات کے تدریجی مراحل کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے۔

" اب یہی اثر تدریجی ترقی کر کے خرما کے درخت میں بغایت شرف ظہور کرتا ہے اور نبات کو مرتبۂ اعلیٰ پر پہنچاتا ہے کہ اگر اس مرتبہ سے ذرا سا بھی بڑھے تو حد نباتی سے نکل جائے اور صورت حیوان اختیار کر لے۔ خرما کے درخت میں نفس کا اثر اس درجہ قوی اور زیادہ ہوتا ہے کہ حیوان سے کثیر مشابہت اور قوی نسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک تو مثل حیوان کے اس میں نر اور

---

[1] المتوفی ۴۲۱ھ ہجری! ڈارون سے کہیں پہلے

مادہ ہوتے ہیں۔ اور بار آور ہونے کے لئے نر کو مادہ سے ملانا ضروری ہوتا ہے۔ اس ملانے کو تلقیح کہتے ہیں۔ جو حیوانات کے جماع کے مثل ہے۔ پھر خرما کے درخت میں علاوہ جڑ اور رگوں کے ایک چیز مثل دماغ حیوانات کے ہوتی ہے۔ یہ اس کے لئے ایسی ضروری ہے کہ اگر اسکو کوئی آفت لاحق ہو تو درخت خرما تلف ہو جائے۔ بخلاف دیگر اشجار کے کہ ان کا صرف ایک ہی مبداء ہوتا ہے۔ یعنی جڑ جو زمین میں قائم رہتی ہے۔ جب تک جڑ رہے گی درخت بھی رہیگا ورنہ ضائع ہو جائے گا۔"

اسی طرح حکیم موصوف بندر اور اس کے مثل اور حیوانات کو حیوانات اور انسان کی درمیانی کڑی قرار دیتے ہیں۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اہلِ اعراف۔ اہلِ جنت اور اہلِ جہنم کی درمیانی کڑی ہیں جن میں دونوں کی خصوصیات موجود ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اعراف میں بھی مزید ترقی کے امکانات و مواقع موجود ہوں۔ اور وہ لوگ اپنے اندر مزید صلاحیت پیدا کر کے۔ اہلِ جنت کے ساتھ جا ملیں۔ کیونکہ ان کی مقدس آرزو اور اہلِ جہنم سے الگ رکھے جانے کی دعا سے ایسا ہی مترشح ہوتا ہے۔ یونیورسٹی والی مثال میں یوں سمجھئے کہ یہ طالب العلم (Compartment) میں آچکے ہونگے اور ان کی ترقی ہنوز مشروط ہوگی۔ بہرحال یہ صرف قیاسات ہیں۔ چونکہ قرآن کریم نے اس باب میں تصریح نہیں فرمائی اس لئے یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

گذشتہ صفحات میں بیان کیا جاچکا ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے جنت اور جہنم میں قیام ہمیشہ کے لئے ہوگا (خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا) لیکن اس دوام اور ہمیشگی سے وہ ابدیت و سرمدیت مقصود نہیں جو باری تعالیٰ کے لئے مختص ہے۔ ان کی ہمیشگی اللہ تعالیٰ کی مشیت سے مشروط ہے۔ فرمایا۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِى النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ۝ خَالِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَاۗءَ رَبُّكَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝ ۱۱/۱۰۷

جو لوگ بدنصیب ہیں وہ جہنم میں جائیں گے۔ ان کے لئے وہاں چیخنا چلانا ہوگا۔ وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ جب تک آسمان و زمین ہیں۔ مگر یہ کہ جو تیرا رب چاہے۔ بلاشبہ تیرا رب جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ
اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ط عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ۝ ۱۱/۱۰۸

اور جو لوگ خوش نصیب ہیں وہ جنت میں جائیں گے۔ ہمیشہ اس میں رہیں گے جب تک کہ آسمان
وزمین ہیں۔ مگر یہ کہ جو تیرا رب چاہے۔ یہ بخشش ہے غیر منقطع۔

سلسلۂ ارتقاء میں پیچھے رُک جانے والی نوع کچھ عرصہ تک علیٰ حالہ باقی رہتی ہے، اس کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ آگے بڑھنے والی نوع کچھ عرصہ اس اگلی منزل میں رہتی ہے۔ اسکے بعد پھر آگے بڑھ جاتی ہے۔ یہ سلسلہ غیر منقطع ہوتا ہے کہ

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود　　ایں مئے کہنہ جواں است و جواں خواہد بود

لیکن غیر منقطع روانی بھی بالآخر منقطع ہونیوالی ہے۔ اسکی ابدیت خدا کی ابدیت کی طرح مطلق نہیں۔ ازلی اور ابدی صرف اسی کی ذات ہے۔ باقی ہر شے کو اس کی منزل پر پہونچکر فنا ہے۔

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ۲۸/۸۸

بجز اس کی ذات کے ہر شے کو فنا ہے

قرآن کریم کی رُو سے نظریۂ نجات کے متعلق یہ چند اجمالی اشارات ہیں جنکا ذکر کیا گیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل کیلئے تو ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے، (چنانچہ میری کتاب معارف القرآن کی آخری جلد اسی موضوع پر مشتمل ہوگی) ان اجمالی اشارات کو سامنے رکھئے اور اسکے بعد غور کیجئے کہ قرآنی نظریۂ نجات کس قدر علم و بصیرت پر مبنی ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو؟ قرآن اس خدا کی کتاب ہے جو علم حقیقی کا سرچشمہ اور دُنیا بھر کو بصیرت عطا کرنیوالا ہے۔ پھر یہ صحیفۂ مقدس ذہن انسانی کی آمیزش سے بالکل پاک و صاف ہے اس لئے اسمیں جو کچھ ہے علم و یقین ہے ظن و قیاس کا اس میں کہیں گذر نہیں۔

یہ بھی واضح رہے کہ حقائق قرآنی کے متعلق جو کچھ ہم سمجھ سکتے ہیں اپنے زمانہ کی علمی سطح کے مطابق ہی سمجھ سکتے ہیں۔ جوں جوں زمانہ تجارب و مشاہدات اور علم و بصیرت کے صحیح خطوط پر آگے بڑھتا جائے گا قرآنی حقائق اور زیادہ بے نقاب ہوتے جائیں گے۔

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ط ۴۱/۵۳

ہم عنقریب انھیں اپنی نشانیاں (عالم) انفس و آفاق میں دکھائیں گے۔ حتیٰ کہ ان پر واضح ہو جائے کہ قرآن فی الواقعہ ایک حقیقت (ثابتہ) ہے۔

زمانہ

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اِک حرفِ محرمانہ!
قریب تر ہے نمود جس کی اُسی کا مشتاق ہے زمانہ!
مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیحِ روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ!
ہر ایک سے آشنا ہوں لیکن جُدا جدا رسم و راہ میری
کسی کا راکب کسی کا مرکب کسی کو عبرت کا تازیانہ!
نہ تھا اگر تو شریکِ محفل، قصور میرا ہے یا کہ تیرا؟
مرا طریقہ نہیں کہ رکھ لوں کسی کی خاطر مئے شبانہ!
مرے خم و پیچ کو نجومی کی آنکھ پہچانتی نہیں ہے
ہدف سے بیگانہ تیر اُس کا نظر نہیں جس کی عارفانہ!

شفق نہیں مغربی اُفق پر یہ جوئے خوں ہے! یہ جوئے خوں ہے!

طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ!

وہ فکر گستاخ جسنے عُریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو

اُسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اُس کا آشیانہ!

ہوائیں ان کی فضائیں ان کی سمندران کے جہاز اُن کے

گرہ بھنور کی کھلے تو کیونکر؟ بھنور ہے تقدیر کا بہانہ!

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالمِ پیر مر رہا ہے

جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ!

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے

وہ مردِ درویش جسکو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ!

(اقبال علیہ الرحمۃ)

نورِ آسمانی کی قندیلِ جہانتاب

معارف القرآن

کی ضیاء پاشیاں شروع ہوگئیں۔ جن اصحاب کی فرمائشیں جمع ہوچکی تھیں اُن کی تعمیل کر دی گئی ہے
اگر اُن میں سے کسی کے پاس ابھی تک کتاب نہ پہنچی ہو تو براہ کرم ہمیں مطلع فرمائیں۔ اگر آپ نے ابھی تک
اپنے لئے نسخہ طلب نہیں فرمایا تو جلدی کیجئے۔ اس لئے کہ

مجلد کتاب

کی کاپیاں بہت کم رہ گئی ہیں۔ اور اشیاء کی گرانی کی وجہ سے شاید اس کے بعد مجلد کتاب اس دام میں
نہ مل سکے۔ قیمت کا آپ کو علم ہی ہے۔

بڑا سائز۔ ۷۶۰ صفحات۔ طباعت	غیر مجلد۔ پانچ روپیہ ۔ محصولڈاک ۱۳ر آنہ۔ کل	۵/۱۳/- روپیہ
کتابت۔ جلد۔ کاغذ۔ اعلیٰ درجہ کا ۔	مجلد ۔ سوا چھ روپیہ۔ " ۱۵ر آنہ۔ کل	۷/۳/- روپیہ

اگر آپ نے اسے ابھی تک نہ دیکھا ہو تو جسکے پاس موجود ہو اس سے لیکر دیکھئے اور پھر جانچئے کہ یہ کتاب
کیا چیز ہے۔! اگر کہیں سے نہ مل سکے تو ہمیں لکھئے۔ آپ کو فہرست مشمولات (بلاقیمت) بھیجدی جائیگی۔
اس سے کچھ اندازہ ہوسکے گا کہ کتاب کیا ہے! کتاب منگانی ہو تو حسب ذیل مقامات سے مل سکیگی۔

لاہور:۔ جناب ملک رشید الدین صاحب۔ سپرنٹنڈنٹ۔ پنجاب کوآپریٹیو یونین
۳۱ - لوئر مال۔ (کتاب دستی مل سکیگی)

نئی دہلی:۔ ۵۱ نورجہاں روڈ

اور **دہلی** میں خود ہمارے یہاں سے۔ یعنی دارالاشاعت معارف القرآن۔
دفتر طلوع اسلام۔ شمیم منزل۔ رشیدی پورہ۔ قرول باغ

ھ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۴۲ء تک انتظار کرنیکے بعد اطلاع دیں

رومی نطشے اور اقبالؒ

جناب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب

(قسط ثالث)

اسرار خودی میں صفحہ ۴۴ پر خودی کے جو تین مراحل بیان کیے گئے ہیں ان میں بھی نطشے کا کسی قدر اثر ہے۔ اقبالؒ نے یہ عنوان تجویز کیا ہے کہ "تربیت خودی را سہ مراحل است۔ مرحلۂ اول را اطاعت و مرحلۂ دوم را ضبط نفس و مرحلۂ سوم را نیابت الٰہی نامیدہ اند"

ان مراحل میں مرحلۂ اول میں خودی کو شتر قرار دیا ہے یہ خیال بعینہٖ نطشے سے ماخوذ ہے۔ باقی دو مراحل اقبالؒ نے اسلامیات سے لیے ہیں نطشے کے ہاں بھی مراحل تین ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ روح حیات تین مراحل میں سے گذرتی ہے یا یوں کہو کہ تبدیلی ہیئت میں وہ یکے بعد دیگرے تین ہیئتیں اختیار کرتی ہے۔ پہلی ہیئت میں وہ اونٹ ہے۔ دوسری میں شیر اور تیسری میں بچہ ہیئت اشتری میں روح نہایت صبر اور جبر سے اپنے اوپر فرائض اور اوامر و نواہی کا بوجھ لادلیتی ہے۔ اس کے بعد جبر اور بار برداری احکام میں سے نکل کر وہ جب ہیئت اختیاری میں آتی ہے تو شیر ہو جاتی ہے۔ اس کا اپنا آزاد ارادہ ہی قانون حیات بن جاتا ہے لیکن نئی اقدار کے پیدا کرنے کیلئے اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ تیسری ہیئت طفلی ہو جس میں معصومیت اور نسیان کی ضرورت ہے۔ پہلے مراحل کو بالکل بھول جائے۔ زندگی کو ایک کھیل سمجھے۔ نئے سرے سے اس کا آغاز کرے۔ گردش ایام کے پہیے کو بازیچہ سمجھ کر گھمائے۔ ایک مقدس اثبات خودی۔ نئی زندگی کی ایک نئی علت۔ اس طرح کہ وہ کسی پہلی چیز کی معلول نہ ہو۔

اقبالؒ نے نطشے کے تین مراحل میں سے صرف مرحلہ اشتری کو لے لیا۔ قرآن کریم نے بھی ہیئت اشتری کی طرف توجہ دلائی ہے۔ فَانظُرْ إِلَىٰ إِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ دیکھو اونٹ کی طرف کہ وہ کس طرح بنایا گیا ہے۔ اسلامی تہذیب و تخیل میں اونٹ علامت قلی کے طور پر بھی استعمال ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے تین مراحل میں سے دو مراحل اطاعت اور ضبط نفس کے اس میں پائے جاتے ہیں۔

نطشے کے ہاں جو مرحلۂ شیری ہے اس کو اقبالؒ نے دوسری جگہ بیان کیا ہے لیکن اس سلسلے میں اس کو نظر انداز کر دیا ہے

نطشے کے ہاں اقبال کی نیابت الٰہی کی جگہ ایک خلق جدید اور ایک آغاز نو ہے جس کو وہ انداز طفلی سے تعبیر کرتا ہے۔

اسرار خودی کے صفحہ ۳۲۔ ۳۳ پر ریزۂ الماس اور شبنم پر جو اشعار ہیں وہ براہ راست نطشے کے زیر اثر لکھے گئے ہیں۔ ایک پرندہ ریزۂ الماس کو شبنم سمجھ کر چاٹنے لگا لیکن اس کی سختی کی وجہ سے شکست کھا گیا۔ اس قسم کا مضمون اقبال نے ابوالعلا معری والی نظم میں بھی بیان کیا ہے۔ معری مذہباً آزاد خیال شخص تھا۔ گوشت نہیں کھاتا تھا کسی نے بھنا ہوا تیتر اس کو بھیجا کہ شاید اس کے منہ میں پانی بھر آئے لیکن وہ تیتر کو مخاطب کر کے پوچھنے لگا کہ کیوں بھائی کس قصور میں یہ سزا ملی؟ خود ہی جواب دیتا ہے کہ یہ کمزور ہونے کی سزا ہے اگر شاہین ہوتا تو خود شکار ہونے کی بجائے دوسروں کا شکار کرتا۔ زندگی میں کمزور ہونا ہی سب سے بڑا جرم ہے۔ اسی طرح الماس و زغال، والی نظم کا مضمون نطشے سے ماخوذ ہے کیمیاوی لحاظ سے ہیرا اور کوئلہ ایک ہی چیز ہے ایک میں مرور ایام سے یہ تبدیلی واقع ہو جاتی ہے کہ وہ کمال سختی کی وجہ سے ہیرا بن جاتا ہے۔ سخت جانی سے زندگی میں آب و تاب پیدا ہو جاتی ہے دوسرا نرم ہونے کی وجہ سے تیرہ رو رہتا ہے۔ نطشے کی اخلاقیات کا اصول اولین جو اس کے مذہب کا کلمہ ہے یہ ہے کہ سخت ہو جاؤ۔ اس اصول کی تشریح میں نطشے نے بھی اسی قسم کے استعاروں سے کام لیا ہے۔

اسرار خودی میں مغربی مفکرین میں سے تین کا اثر نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ اساس خودی کا بیان جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے نطشے سے ماخوذ ہے۔ استحکام خودی، سخت کوشی اور تلخ پسندی کا فلسفہ نطشے کا ہے لیکن حقیقت وقت اور سیلان حیات کے متعلق جو اشعار یا نظریے ہیں وہ برگساں سے ماخوذ ہیں۔ برگساں کا اثر اقبال پر اسرار خودی کے بعد بھی قائم رہا۔ افسوس ہے کہ اسرار خودی میں اقبال نے برگساں کا نام نہیں لیا اور اس کا تمام فلسفۂ وقت حضرت امام شافعیؒ کے ایک قول کے ماتحت منظم کر دیا ہے۔ حضرت امام شافعی کے قول کے تحت میں کوئی فلسفہ نہیں تھا۔ جو فلسفہ اقبال نے برگساں سے لے کر اس قول کی تفسیر میں پیش کر دیا ہے وہ خود امام صاحبؒ کی سمجھ میں نہ آتا۔ ان کا تدین اور تورع ایسے افکار سے بہت گریزاں تھا برگساں کا یہ فلسفہ توحید کے مقابلے میں دہریت سے زیادہ قریب ہے۔ برگساں دہر ہی کو اصل حقیقت تصور کرتا ہے اور دہر کو وقت قرار دے کر وقت کی ماہیت کو بڑی تدقیق سے بیان کرتا ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ زمان یا وقت، مکان سے بالکل الگ چیز ہے مگر عام طور پر نفس انسانی زمان کو بھی مکان ہی پر قیاس کر لیتا ہے۔ زمان ایک لامکانی اور تخلیقی قوت ہے تغیر اور ارتقا اس کی ماہیت میں داخل ہیں اور اس کے سوا کسی حقیقت ثابتہ کا وجود نہیں۔ اقبال نے لا تسبوا الدھر کی حدیث قدسی سے مدد لے کر برگساں کی دہریت کو توحید کا ہم رنگ بنانے کی کوشش کی ہے۔

زندگی از دہر و دہر از زندگی است　　　لا تسبوا الدہر فرمان نبی است

مذکورہ صدر بیانات کی تائید مندرجہ ذیل اقتباس سے ہو جاتی ہے

ای اسیر دوش و فردا در نگر
در دل خود عالم دیگر نگر

در گل خود تخم ظلمت کاشتی
وقت را مثل خطے پنداشتی

باز با پیمانۂ لیل و نہار
فکر تو پیمود طول روزگار

ساختی ایں رشتہ را زنار دوش
گشتہ مثل بتاں باطل فروش

تو کہ از اصل زماں آگہ نۂ
از حیات جاوداں آگہ نۂ

ایں و آں پیداست از رفتار وقت
زندگی سر است از اسرار وقت

اصل وقت از گردش خورشید نیست
وقت جاوید است خور جاوید نیست

وقت را مثل مکاں گستردۂ
امتیاز دوش و فردا کردۂ

وقت ما کو اول و آخر ندید
از خیابان ضمیر ما دمید

خلاصہ

اس مضمون کا مقصد یہ نہیں کہ اقبال کے بعض افکار کے ماخذ کو تلاش کرکے اس کے درجۂ کمال میں کوئی کمی پیدا کی جائے۔ شعر کی کئی قسمیں ہیں اور اس کے لحاظ سے شاعروں کی بھی بہت سی قسمیں ہیں کوئی غزل گو مترنم شاعر ہے کوئی رزمی شاعر ہے کوئی بزمی شاعر ہے۔ کوئی عشق مجازی کا شاعر ہے اور کوئی عشق حقیقی کا۔ کوئی حب وطن کا شاعر ہے اور کوئی حب فطرت کا شاعر ہے۔ کوئی ماضی کا شاعر ہے کوئی حال کا شاعر اور کوئی مستقبل کا شاعر ہے کوئی اخلاقی شاعر ہے اور کوئی قومی شاعر، کوئی صوفی شاعر ہے اور کوئی رند شاعر اگر یہ سوال اٹھایا جائے کہ اقبال کو کس صنف میں داخل کیا جائے تو اس کے جواب میں بڑی مشکل پیش آئے گی اس کی شاعری اتنی ہمہ گیر ہے کہ شاعری کی شاید ہی کوئی صنف ہو جو اقبال سے چھوٹ گئی ہو۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ آخر میں ایک مفکر شاعر اور مبلغ شاعر کا رنگ اقبال میں غالب نظر آتا ہے۔ اعلیٰ درجے کی شاعری میں جو جذبۂ نبوت کا ہوتا ہے وہ اقبال کی

شاعری کے آخری دور میں بہت نمایاں ہوگیا۔ اس مضمون کے ضمن میں فقط اتنی گنجائش ہے کہ ہم مختصراً اندازہ کریں کہ بحیثیت ایک مفکر شاعر کے اقبال کا کیا مقام ہے لیکن اس تقدیر و تخمین سے پہلے میں شعر اور تفکر کی باہمی نسبت کو واضح کر دینا مناسب سمجھتا ہوں جس سے اقبال کے متعلق صحیح اندازہ کرنے میں مدد ملے گی۔

انسانی رجحانات طبع میں ہر قسم کے مرکبات کا امکان ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ انسانی فطرت کے بعض میلانات بعض دوسری قسم کے میلانات کے ساتھ ہم کنار نہیں ملتے بشلاً یہ سمجھا جاتا ہے کہ ریاضی داں یا سائنسداں ادیب نہیں ہو سکتا یا فلسفی خشک استدلالی ہونے کی وجہ سے شاعر نہیں ہو سکتا۔ خود شاعری کے اندر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ایک انداز سخن کا قادر الکلام شاعر دوسرے انداز سخن میں سپر انداختہ ہو جاتا ہے لیکن انسان کی تاریخ افکار اور تاریخ کمالات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گو عام طور پر اس قسم کے استقرا صحیح ہوتے ہیں لیکن کوئی اٹل اور کلی قواعد اس بارے میں ایسے نہیں ہیں جن کے تحت قطعی طور پر یہ کہ سکیں کہ فلاں اور فلاں قسم کے کمالات ایک انسان میں یکجا نہیں ہو سکتے۔ قرآن کریم میں بھی اسی وجہ سے عام شعرا کے متعلق استقرا قائم کرتے ہوئے استثنائی صورتوں کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے کہ شعرا گو عام طور پر بے عمل اور رہبری کے نااہل ہوتے ہیں لیکن کہیں کہیں ایمان اور عمل والے شاعر بھی ملتے ہیں۔

یہاں پر ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اگر شاعر محض شاعر ہونے کے علاوہ مفکر بھی ہو تو وہ کس قسم کا مفکر ہو سکتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر تفکر عبارت ہے استدلال منظم سے تو شاعری میں اس کی گنجائش بہت کم ہے محض فلسفے کو نظم کرنے سے فلسفہ بھی نشتر ہو جاتا ہے اور شاعری بھی پھیکی ہو جاتی ہے کسی نتیجے تک پہنچنے کے لئے استدلالی طریقے سے افکار کی تخلیق و تنظیم شاعروں کا کام نہیں اس لئے مفکر شاعر عام طور پر وہ شخص نہیں ہوتا جو اپنی شاعری میں علم و حکمت کی تخلیق کرے شاعری ایک خاص طرز احساس، طرز تاثر اور طرز بیان کا نام ہے۔ بڑے بڑے مفکر شاعروں نے یہی کیا ہے کہ جو افکار ان کی قوم میں یا کسی دوسری قوم میں پیدا ہو کر اہل علم میں عام ہو چکے تھے ان کو شعر کا جامہ پہنا کر ایسی روح ان کے اندر پھونکی ہے ان کو بقائے دوام حاصل ہو گیا ہے۔ شاعری دماغ کی زبان نہیں دل کی زبان ہے لیکن دل اور دماغ آخر انسان ہی کے دل و دماغ ہیں۔ ان کا ہمیشہ الگ الگ بولی بولنا ضروری نہیں۔ دماغ کی زبان کی ترجمانی دل کی زبان میں بھی ہو سکتی ہے مگر اپنے انداز سے مفکر شاعروں کا اکثر یہی وظیفہ رہا ہے کہ وہ زندگی کے عام تجربات کو اور خالص مفکروں کے پیدا کردہ افکار اور صوفیا کے عشق کردہ اور محسوس کردہ وجدانات کو شعریت کے خم میں ڈبو کر رنگین اور دل نشین بناتے رہے ہیں فن لطیفہ کی دلکشی اور دل نشینی کا نام ہی اور شاعر کا اصل وظیفہ یہی ہے۔ شاعر کا کمال اس کی حساسی اور انداز بیان میں ہے وہ دنیا میں پھیلے ہوئے تصورات و خیالات و تجربات کو کبھی رنگین کر دیتا ہے۔ اور کبھی دل سوز شاعر کا کمال افکار کی تخریج میں نہیں ہے اس کا کام معلوم افکار کو دل آویز اور دل نو

بنا دیتا ہے۔ جو خیالات محض دماغ آفریدہ ہونے کی وجہ سے باہر سے ہی قلب کا طواف کرتے رہتے ہیں وہ شعر کی بدولت دل میں داخل ہو جاتے ہیں اور سننے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ حقیقت پہلی مرتبہ اس پر منکشف ہوئی حالانکہ ہو سکتا ہے کہ تمام عمر وہ بات اس کے کان میں پڑتی رہی ہو لیکن ہوتا یہ ہے کہ شاعر کے اعجاز بیان کے بغیر وہ پردہ گوش سے پردہ دل تک سفر نہیں کرتی حافظے کی لوح پر وہ محفوظ ہوتی ہے لیکن شاعر کی آواز کے بغیر دل کے تار اس سے مرتعش نہیں ہوتے۔ خود اقبال نے حکمت استدلالی اور شعر میں ڈوبی ہوئی حکمت کا ایک دل آویز طریقے سے مقابلہ کیا ہے ؎

حق اگر سوزے ندارد حکمت است　　شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

بوعلی اندر غبار ناقہ گم　　دست رومی پردۂ محمل گرفت　　اقبالؒ

شعر میں اقبال نے حکمت کے جو موتی پروئے ہیں ان کے متعلق محض یہ کہہ دینا ناانصافی ہوگی کہ وہ موتی اس نے دوسرے جوہریوں سے لئے ہیں۔ ہیرا جب تک تراشا نہ جائے اور موتی جب تک بالائیں پرویا نہ جائے اور جواہرات جب تک زیور میں جڑے نہ جائیں۔ ان کا جمال معمولی سنگ ریزوں اور خزف پاروں سے زیادہ نہیں ہوتا اقبالؒ نے شاعری پر جو احسان کیا ہے وہ یہ ہے کہ مشرق اور مغرب اور ماضی اور حال کے وہ جواہر پارے جو نفس انسانی کے آسمان کے تارے ہیں کمال شاعری سے اس طرح تراشے اور پروئے اور جڑے ہیں کہ نوع انسان کے لئے ہمیشہ کے لئے بصیرت افروز ہو گئے ہیں۔ شعر کی دنیا جو انسانی قلب کی دنیا ہے اس ثروت سے مالا مال ہو گئی ہے اور اردو اور فارسی کی شاعری پر جو یہ تہمت تھی کہ اس کا دائرۂ تصورات بہت محدود ہے اور شعرا بار بار ایک ہی قسم کے خیالات کے گرد گھومتے رہتے ہیں، وہ تہمت رفع ہو گئی ہے بڑے سے بڑے مفکر شاعر نے بھی خواہ وہ رومی ہوں یا عطار یا سنائی یا گوئٹے یا تینی سن یا براؤننگ اس سے زیادہ کوئی کام نہیں کیا اقبال کی حکیمانہ شاعری کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جو دوسرے مفکر شعرا میں بہت کم یاب بلکہ نایاب ہے۔ جہاں تک افکار کا تعلق ہے اس نے نہ رومی کا کامل تتبع کیا ہے نہ نطشے کا نہ برگساں کا اور نہ کارل مارکس یا لینن کا اپنے تصورات کا قالین بنتے ہوئے اس نے رنگین دھاگے اور بعض خاکے ان لوگوں سے لئے ہیں لیکن اس کے مکمل قالین کا نقشہ کسی دوسرے کے نقشے کی ہو بہو نقل نہیں ہے اپنی تعمیر کے لئے اس نے ان افکار کو سنگ و خشت کی طرح استعمال کیا ہے۔ اقبال ان مفکر شاعروں میں سے ہے جن کے پاس اپنا ایک خاص زاویۂ نگاہ اور نظریۂ حیات بھی ہوتا ہے محض افکار کے ادھر ادھر سے اخذ کردہ عناصر سے اس کی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ گوئٹے نے جو ایک لحاظ سے اقبال کا پیش رو ہے، اسی خیال کو ایک عجیب پیرائے میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرے افکار کی تعمیر سے قطع نظر کر کے فقط میرے جسم کی تعمیر کر لو۔ کیا ان عناصر سے جو میں نے بطور خوراک اپنے اندر جذب کئے ہیں میری شخصیت کی توجیہ ہو سکتی ہے؟ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ گوئٹے نیتجہ ہے اتنے سو بکروں اور گایوں اور خنزیروں کا، اور

اور خوش ہے اتنے تن آور کار پورا، اور اناجوں کا تو کس قدر حل بات ہوئی۔ یہ تمام غذائیں گوشت میں آ کر گوشت بن گئی ہیں۔ یہی حال اقبال کا ہے۔ اقبال کے اندر رومی بھی ہے، اور نطشے بھی، کانٹ بھی اور برگساں بھی، کارل مارکس بھی اور لینن بھی اور شاعری کے لحاظ سے بیدل بھی اور غالب بھی لیکن اقبال کے اندر ان سب میں سے کسی کی اپنی حیثیت جوں کی توں قائم نہیں ہے رومی کا انسان کامل اور مرد عارف نطشے جیسے کافر کے فوق الانسان سے ہم کنار ہو کر اقبالی انسان بن گیا ہے برگساں کی ارتقائیت اسلام کی توحید سے مل کر کچھ اور چیز ہو گئی ہے اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو اقبال کے اندر یہ عجیب و غریب کمال نظر آئے گا کہ زندگی کے بظاہر متضاد اور متخالف نظریات اس میں عجیب طرح سے ترکیب پا گئے ہیں بعض نقادوں کا خیال ہے کہ اقبال ان متضاد چیزوں کو جوڑ نہیں سکا، جس وقت جو جس سے چاہا لے لیا یہی اعتراض افلاطون پر بھی کیا گیا ہے، جلال الدین رومی پر بھی اور نطشے پر بھی یہ کون کہہ سکتا ہے کہ زندگی کے مختلف پہلوؤں اور افکار و تاثرات کی گوناگونی کو کوئی صاحب کمال ایک رنگ میں لا بھی سکتا ہے یا نہیں اقبال کا کمال یہ ہے کہ متضاد رنگوں کے تار و پود کو وہ دلکش نقشوں میں بن لیتا ہے منطقی حیثیت سے کسی کو تشفی ہو نہ ہو لیکن بیان کی ساحری ایسی ہے کہ اقبال کو پڑھتے ہوئے کسی تضاد کا احساس نہیں ہوتا۔

عارف رومی کو اقبالؒ اپنا مرشد سمجھتا ہے۔ جاوید نامے میں افلاک اور ماورائے افلاک کی سیر میں وہ رہنما ہے۔ تمام حقائق اور واردات کی اصلیت اقبال پر اسی مرشد کے سمجھانے سے کھلتی ہے۔ بال جبریل میں پیر و مرشد کا مکالمہ بھی اس پر دلالت کرتا ہے اقبال کو نبی کریم علیہ السلام کے بعد پیر رومی ہی سے گہرا واسطۂ روحانی ہے دیگر حکما پر اقبال مخالفانہ تنقید بھی کرتا ہے لیکن پیر رومی کے ساتھ رشتۂ عقیدت بہت راسخ اور غیر متزلزل ہے اقبال کے ارتقائے عقلی و روحانی میں یہ رشتہ روز بروز مضبوط ہوتا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال جیسے آزاد خیال شخص کو اگر کسی کا مرید کہہ سکتے ہیں تو وہ پیر رومی ہی کا مرید ہے۔ دیکھنا چاہیے کہ تمام صوفیائے کرام میں سے اقبال نے اس مرشد کو کیوں منتخب کیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ رومی کا تصوف اسلامی تصوف کی مختلف قسموں میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ عشق اور عقل کا باہمی تعلق جس پر اقبال نے اپنی شاعری کا بہت سا حصہ وقف کیا ہے، پیر رومی کا خاص مضمون ہے۔ اقبال نے اس مضمون میں فقط مرشد کے الفاظ کو دہرایا نہیں بلکہ جدت افکار سے اس میں بہت دلکش رنگ اپنی طرف سے بھرے ہیں۔ رومی کے تصوف میں حرکت اور ارتقا کے تصورات بڑی کثرت سے ملتے ہیں۔ رومی آزادیٔ ارادہ یعنی جبر کے مقابلے میں اختیار کا قائل ہے۔ تقدیر کا مفہوم رومی کے ہاں عام اسلامی متفکرین سے بالکل الگ ہے وہ جہاد کو انسان کی تقدیر قرار دیتا ہے انسان کی ماہیت اور اس کے کمال کے ممکنات رومی کے فلسفے میں اس انداز سے بیان ہوتے ہیں کہ وہ جرأت افکار میں بعض اوقات نطشے کا

پیش رو معلوم ہوتا ہے۔ رومی انفرادی بقا کا قائل ہے اور کہتا ہے کہ خدا میں انسان اس طرح محو نہیں ہو جاتا جس طرح کہ قطرہ سمندر میں محو ہو جاتا ہے بلکہ ایسا ہوتا ہے جیسے سورج کی روشنی میں چراغ جل رہا ہے یا جیسے لوہا آگ میں پڑ کر آگ ہو جاتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے اس کی انفرادیت باقی رہتی ہے۔ تقویم خودی، تحقیق ذات اور ارتقائے انا کے مضامین جو اقبال کو بہت پسند ہیں اور اقبال کی شاعری کا امتیازی جوہر ہیں رومی کے ہاں جا بجا ملتے ہیں

دانہ باشی مرغکانت برچنند　　　غنچہ باشی کودکانت برکنند
دانہ پنہاں کن سراپا دام شو　　　غنچہ پنہاں کن گیاہ بام شو

تسخیر کائنات اور عروج آدم اقبال کی طرح رومی کا بھی خاص مضمون ہے :-

آں کہ بر افلاک رفتارش بود　　　بر زمیں رفتن چہ دشوارش بود

رومی کے ہاں کے بہترین تصورات اقبال میں ایک جدید رنگ میں ملتے ہیں لیکن زمانہ کے اقتضاء سے بعض امور میں مرید مرشد سے آگے نکل گیا ہے۔ تعمیر ملت اور حقیقت اجتماعیہ کا جو فلسفہ اقبال نے بیان کیا ہے اس کی فقط کہیں کہیں جھلکیاں رومی میں مل سکتی ہیں۔ جس خوبی اور شرح و بسط کے ساتھ اقبال نے اس میں نکتہ آفرینی کی ہے وہ اقبال ہی کا حصہ ہے۔ رومی کا جذبۂ عشق بہت حد تک محویت ذات الٰہی کے تاثرات میں رہ جاتا ہے۔ اقبال کے ہاں جذبۂ عشق ایک جذبۂ تخلیق، جذبۂ تسخیر اور جذبۂ ارتقاء بن گیا ہے اور اس پہلو سے اقبال نے ایسے مضامین پیدا کئے ہیں جن کا مرشد کے ہاں مشکل سے کوئی نشان ملے گا۔

نطشے کی مریدی اقبال نے اس حد تک بھی قبول نہیں کی جس حد تک کہ اس نے مرشد رومی کا اتباع کیا ہے۔ نطشے کے افکار میں سے اقبال کو تعمیر خودی، استحکام خودی اور عروج آدم کا مضمون پسند آیا۔ لیکن نطشے کے ہاں سے تخریبی افکار بہ نسبت ترکیبی افکار کے بہت زیادہ ملتے ہیں۔ اس میں جلال کا پہلو جمال کے پہلو پر اس قدر غالب ہے کہ ہستی محض ایک میدان کارزار بن جاتی ہے۔ اقبال خودی کے ساتھ ایک بے خودی کا فلسفہ بھی رکھتا ہے۔ ایک کو دوسرے کے بغیر ناقص سمجھتا ہے۔ نطشے کے ہاں انفرادی خود اختیاری کا اس قدر زور ہے کہ فرد کا رشتہ ملت اور کائنات سے نہایت غیر معین اور مبہم سا رہ جاتا ہے۔ اس کے ہاں قاہری غالب ہے اور دلبری مغلوب۔ اقبال کے نصب العین انسان میں ناز کے ساتھ نیاز بھی ہے۔ اور خدا کے ساتھ تسلیم و رضا بھی ہے۔ نطشے جمہوریت اور مساوات کا دشمن ہے اور غریبوں اور کمزوروں کے لئے اس کے پاس نفرت کے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ اقبال بھی جمہوریت کی موجودہ شکلوں کو دھوکا سمجھتا ہے لیکن ایک اعلیٰ مطمح پر صحیح مساوات کا متلاشی ہے اور ایسے خدا کا قائل ہے جو اپنے فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ اٹھو! میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو۔ نطشے کے ہاں صداقت کا معیار قوت کے سوا کچھ نہیں۔ تنازع للبقا کا انداز ظالمانہ، بے رحم اور جابرانہ ہے۔ اقبال کے

ہاں محض قوت صداقت کا معیار نہیں۔ نطشے خدا کا منکر ہے، اقبال اعلیٰ درجہ کا موحد ہے۔ نطشے مجذوب ہے اور اقبال حکیم ہے۔ اقبال تمام نوع انسانی کو ابھارنا چاہتا ہے۔ نطشے کی نظر فقط چند کامل افراد پر ہے جو تمام پیکار حیات کا حاصل ہیں نطشے نے ڈارون کے نظریۂ حیات پر اخلاق اور فلسفے کی بنیاد رکھی اس کا یہ خیال کہ اسی نظریے کے ماتحت آئندہ انسان موجودہ انسان سے اتنا ہی مختلف ہو سکتا ہے جتنا کہ موجودہ انسان کیڑوں مکوڑوں سے مختلف ہو گیا ہے، انسانی نصب العین میں بڑی قوت پیدا کر سکتا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ نطشے کسی وجہ سے بڑے زور و شور سے یہ عقیدہ بھی رکھتا تھا کہ کائنات اپنے حوادث کو ازلی اور ابدی طور پر دہراتی رہتی ہے جو کچھ ہو رہا ہے وہ پہلے بھی ہو چکا ہے، جو مخلوق اس وقت ہے وہ پہلے بھی موجود رہ چکی ہے اور آئندہ بھی بار بار وجود میں آتی رہے گی تکرار ابدی کا یہ عقیدہ نطشے کے جوش ارتقاء کے خلاف پڑتا ہے اگر حرکت حقیقت میں ارتقائی نہیں بلکہ دوری ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ محض تکرار ہے تو تمام ذوق پیکار جہل اور جدید انسان کی تخلیق کا خیال بے معنی ہو جاتا ہے۔ نطشے کے افکار میں جا بجا متناقضات پائے جاتے ہیں لیکن ارتقاء اور تکرار کا تناقض بڑا شدید ہے۔ اقبال اور رومی دونوں کے افکار اس تناقض سے بری ہیں ؎

ہو لحظہ نیا طور نئی برق تجلی　　اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

مولانا روم فرماتے ہیں کہ میری زندگی ایک عروج مسلسل ہے۔ میں ذرات پریشاں سے شروع ہوا تھا، جماد و نباتات و حیوان سے گذرتا ہوا انسان تک پہنچا ہوں :۔ ع

مردم از حیوانی و آدم شدم　　پس چہ ترسم کے ز مردن کم شوم

عارف رومی کا نظریہ یہ ہے کہ زندگی میں نہ رجعت ہے نہ تکرار۔ اس نظریے میں اقبال رومی کا ہم نوا ہے اور دونوں نطشے کے مخالف ہیں ؛

استدراک

جناب خلیفہ عبدالحکیم صاحب کا قابل قدر مضمون آپنے ملاحظہ فرمالیا۔ جیسا کہ شروع میں لکھا گیا تھا اس مضمون میں بعض مقامات ایسے ہیں جو تھوڑی سی وضاحت چاہتے ہیں اور اسی کے لئے اس استدراک کی ضرورت سمجھی گئی ہے۔

(۱) موسیقی پر بحث کرتے ہوئے خلیفہ صاحب نے فرمایا ہے۔

"موسیقی کہنہ حیات کا رمزی اظہار ہے مسلمان صوفیاء میں بھی جو جذبۂ عشق کے دل دادہ تھے موسیقی کی نسبت اسی قسم کے خیالات ملتے ہیں (یعنی جیسے نطشے کے ہاں موجود ہیں۔ طلوع اسلام) صوفیاء کے ایک طبقہ

نے اس غرض سے موسیقی کو عبادت میں داخل کرلیا۔ رقص اور موسیقی جلال الدین رومی کے مریدوں کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔ صوفیاء کے دوسرے سلسلوں میں جذبہ آفریں موسیقی روحوں کو گرمانے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں"

موسیقی کو ادراکِ حقیقت سے کیا تعلق ہے اور کیا اس سے فی الواقعہ رموزِ حیات منکشف ہوتے ہیں یہ ایک طویل بحث ہے جس کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ تصوف کی ماہیت اور تاریخ سے واقفیت حاصل کیجائے۔ تصوف ایک اہم عنوان ہے جس کے متعلق ضمناً کچھ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے محترم جناب پرویز صاحب نے عرصہ ہوا ہم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس موضوع پر سیر حاصل بحث کریں گے۔ اس جگہ غیر موزوں نہ ہوگا اگر ہم انھیں ان کا وعدہ یاد دلائیں۔

جہاں تک ہم سمجھ سکے ہیں موسیقی کا تعلق ادراکِ حقیقت اور رموزِ حیات سے کہیں زیادہ انسان کے نظامِ عصبی سے ہے۔ مختلف آوازوں کی ہم آہنگی انسانی اعصاب پر خاص اثر کرتی ہے کہیں اس سے ہیجان و تحرک پیدا ہوتا ہے جیسے فوجی باجوں سے کہیں یہ بہجت و مسرت کی بیداری کا موجب ہوتا ہے جیسے بعض خاص قسم کی راگنیوں سے جو اس غرض کے لئے وضع کی گئی ہیں اور کہیں یہ یاس و افسردگی کے اثرات کی تخلیق کرتا ہے۔ جیسے بعض دوسری قسم کی راگنیاں یا اس قسم کے ساز۔ لیکن جوش و تحریک ہو یا رقص و جنون۔ مسرت و شگفتگی ہو یا پژمردگی اور افسردگی۔ موسیقی میں ایک قدر مشترک ہر جگہ پائی جاتی ہے یعنی اس سے ایک گونہ بیخودی۔ محویت ضرور حاصل ہوجاتی ہے۔ اعصاب پر اس کا اثر اس قدر غالب آجاتا ہے کہ وہ دماغ کو اپنے اندر جذب کرلیتا ہے اور کم از کم اتنے وقت کے لئے انسان ادھر ادھر کے خیالی تفکرات سے آزاد ہوجاتا ہے۔ یہی موسیقی کا اصل ہے۔ پھر اس کا اثر مختلف انسانوں پر۔ ان کی عصبی کیفیت کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے۔ اعصابی کمزوری کی صورت میں یہ ایسی کیفیت پیدا کردیتا ہے کہ انسان اپنے آپ پر قابو نہیں رکھتا۔ اسی کا نام وجد و رقص ہے۔ ظاہر ہے کہ ان چیزوں کو ادراکِ حقیقت اور انکشافِ رموزِ حیات سے کیا تعلق! یہ یونان کی دیویوں کے مندروں میں ہو یا ہندوستان کے رشی استھانوں میں۔ ایران کے آتشکدوں میں ہو یا صوفیاء کے زاویوں میں۔ اپنے جذبات کے گرمانے اور بہلانے کا ذریعہ ہے۔ **عبادت** (یعنی اسلامی عبادت) اس سے بہت مختلف شے ہے۔

---

(۲) حضرت علامہ اقبالؒ نے سقراطی افلاطونی نظریۂ حیات پر بڑی سخت تنقید کی ہے۔ اس سلسلہ میں جناب

خلیفہ عبدالحکیم صاحب فرماتے ہیں کہ

"اس تلخ تنقید کا ماخذ نطشے ہی کا وہ زبردست وار ہے جو اس نے افلاطون کی عقلیت پر کیا ہے "

پیام اقبال کے ماخذ دریافت کرنے میں عام طور پر ایک بنیادی غلطی کی جاتی ہے۔ کیا عام طور پر یہ جاتا ہے کہ اقبال کا پیام سامنے رکھکر یہ دیکھا جاتا ہے کہ کیا اس کے پیش رو یا ہمعصر حکماء میں سے کسی نے ایسا یا اس سے ملتا جلتا نظریہ پیش کیا ہے اگر اس کا جواب اثبات میں ملتا ہے تو فوراً کہہ دیا جاتا ہے کہ اقبال کے اس نظریہ کا ماخذ فلاں حکیم کا نظریہ ہے۔ ہم حضرت علامہ کو مامور من اللہ نہیں مانتے کہ انھوں نے اکتسابی طور پر کچھ حاصل نہیں کیا تھا لیکن جب وہ خود اپنے ماخذ کے متعلق بار بار اعلان کرتے ہیں تو ہمیں اس سے باہر کہیں اور ماخذ تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی **مثنوی** (اسرار و رموز) میں جس میں انھوں نے افلاطونی نظریہ اعیان پر تنقید کی ہے۔ انھوں نے کھلے کھلے الفاظ میں نہایت شرح و بسط سے کہہ دیا ہے کہ میرے نظریات زندگی کا ایک اور صرف ایک ماخذ ہے۔ یعنی قرآن حکیم : افلاطونی نظریہ زندگی پر انھوں نے اپنے خطبات (تشکیل جدید الٰہیات) میں بحث کی ہے اور آیات قرآنی سے ثابت کیا ہے کہ یہ نظریہ کس قدر خلاف تعلیم اسلام ہے۔ جب ہمیں خود مصنف کے ہاں سے اس قدر دلائل و شواہد مل جائیں تو پھر اس کے ماخذ کے متعلق مشرق و مغرب میں ریسرچ کرنا تحصیل حاصل بلکہ خود مصنف سے خلاف منشا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ حضرت علامہؒ کے کسی نظریہ کی تائید ان کے ہم عصر یا پیش رو حکماء میں سے کسی کے ہاں مل جائے لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ حضرت علامہؒ کے نظریہ کا ماخذ وہی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے (اور اس کی مثالیں موجود ہیں) کہ حضرت علامہؒ نے اپنے نظریات کی وضاحت کے لئے ایسی تشبیہات و استعارات استعمال کئے ہوں جو دوسروں کے ہاں پائے جاتے ہیں لیکن اس سے بھی یہ مطلب نہیں کہ ان کا ماخذ انہی کو قرار دیا جائے حضرت علامہ اقبالؒ کی تصریحات کے مطابق ان کے نظریات زندگی کا ماخذ صرف قرآن کریم ہے وہ جس نظریے کی مخالفت کرتے ہیں اس لئے کہ وہ قرآن کے خلاف ہوتا ہے اور جس کی موافقت کرتے ہیں اس لئے کہ اس کی تائید قرآن سے ملتی ہے اس بنیادی اصول کو سامنے رکھنے سے ہم بہت سی بیجا بحث و تمحیص سے بچ سکتے ہیں :

(۳) اقبال اور نطشے کے توافق میں جناب خلیفہ صاحب فرماتے ہیں۔

"نطشے جمہوریت کا دشمن ہے۔ اور اقبالؒ نے بھی جابجا اپنی نظموں میں جمہوریت پر نکتہ چینی کی ہے "

یہ درست ہے کہ اقبال اور نطشے دونوں جمہوریت کے دشمن ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ان دونوں کی دشمنی کی بنیاد کیا ہے؟ اگر ان دونوں کے ہاں یہ بنیاد مختلف ہے تو محض آلی توافق سے حقیقی توافق نہیں پیدا ہوتا نطشے جمہوریت کا اس لئے دشمن ہے کہ اس کے نزدیک حکومت کا حق اعلیٰ درجہ کے افراد کو ہونا چاہیے۔ وہ عوام کو اس کا اہل نہیں سمجھتا لیکن اقبال جمہوریت کا

اس لئے دشمن ہے کہ اس کے نزدیک حکومت کا حق انسانوں کو نہیں بلکہ صرف خدا کو حاصل ہے۔ انسانی اندازِ حکومت میں جمہوریت سب سے بلند درجہ پر تبائی جاتی ہے۔ لیکن جمہوریت بھی تو اسی اصول پر متفرع ہے کہ انسان کو حق حاصل ہے کہ دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ اقبال رح کے نزدیک یہ مسلمہ ہی غلط ہے اس لئے اس غلط بنیاد پر جو عمارت بھی اٹھائی جائیگی وہ غلط ہوگی۔ اس لئے اقبال جس طرح جمہوریت کا دشمن ہے اسی طرح نطشے کے اس اندازِ حکومت کا بھی دشمن ہے جس میں حکومت کا حق قوم کے اعلیٰ پایہ کے افراد کو تفویض کیا جاتا ہے۔

---

(۴) جناب خلیفہ صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ "اقبال جہاں آدم کا مقابلہ خدا سے کرتا ہے تو خدا کی خدائی پر ایک چوٹ کر جاتا ہے" یہ درست ہے کہ اقبال آدم کی امکانی وسعتوں کا تذکرہ اپنے خاص رنگ میں کرتا ہے لیکن اس کی یہ چوٹ طنز و تعریض کی چوٹ نہیں بلکہ ستائش و نیایش کا ایک حسین انداز ہے اقبال خدا کو احسن الخالقین مانتا ہے (ملاحظہ ہو تشکیل جدید) اس لئے آدم اپنے جوہرِ تخلیق میں کتنا ہی بلندیوں نہ ہو بہرحال احسن سے نیچے ہی رہیگا۔ دوسرے یہ کہ انسان کی ہنرمندیاں خود اس کے خالق کی محمودیت کی دلیل ہیں۔ ریڈیو کی حمد و فراموش قوتیں بہرحال مارکونی کی حمد و ستائش کے نغمات ہی تو ہیں اندازِ بیان کی شوخی یہ کہہ سکتی ہے کہ ریڈیو کی لہریں اپنی پہنائیوں میں مارکونی کی محدود آواز پر خندہ زن ہیں لیکن درحقیقت یہ انداز بھی مارکونی کی قوتِ تخلیق کا قصیدہ مدحیہ ہوگا (اور خدا اور آدم کی نسبت تو اس مثال سے بھی اونچا ہے)

---

(۵) نطشے اور اقبال میں سب سے بڑا اور بنیادی فرق یہ ہے کہ نطشے "قوت اور صرف قوت کا پیغامبر ہے۔ اس کے نزدیک "ہر طریق زندگی اور طرزِ فکر جس سے قوت پیدا ہو خیر ہے" اقبال بھی قوت کا مبلغ ہے۔ اس کے نزدیک بھی "جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات ہے" لیکن اقبال انسانی قوتوں کو احکام خداوندی کے تابع رکھتا ہے۔ انھیں عناں گسیختہ نہیں ہونے دیتا۔ اسلام قوت اور شوکت کا مذہب ہے۔ اس لئے جہاں جہاں کمزوری اور پستی کے خلاف آواز بلند ہوگی اقبال اس کی تائید کریگا لیکن اس تائید کے ساتھ ہی وہ قوت کی سرکشی کی سخت مخالفت کرے گا وہ قوت موسوی کا مبلغ ہے۔ قوت فرعونی کا نہیں۔ اس لئے وہ اس حد تک تو نطشے کا موئید ہے کہ اس نے کمزوری اور پستی کے خلاف آواز اٹھائی لیکن اس سے آگے جہاں نطشے اس قوت کو بے پناہ اور قیود و آداب سے آزاد دیکھنے کا مدعی ہے۔ اقبال اس کی مخالفت کرے گا۔ نطشے کا فوق البشر اپنے دعویٰ انانیت میں خود خدائی کا مدعی ہے لیکن اقبال کا مردِ مومن نیابت خداوندی کا مظہر ہے۔ یہی فرق ہے ایک حکیم مغرب اور حکیم مومن میں ہے۔ امید ہے ان توضیحات سے جناب خلیفہ صاحب کے مفید مضمون کی افادی حیثیت اور بھی بڑھ جائیگی۔

نقد و نظر

۱- لطشِ قدیر بر قادیانی تفسیر کبیر

کہتے ہیں کہ حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے سامنے کسی نے ذکر کیا کہ فلاں صاحب (جو روحِ اسلام سے ناآشنا اور عربی سے ناواقف تھے) قرآنِ کریم کی تفسیر لکھنے کا ارادہ کر رہے ہیں تو انھوں نے اپنے خاص انداز میں فرمایا کہ دُنیا میں دو چیزیں سب سے زیادہ مظلوم ہیں۔ انسانوں میں جناب امام حسین علیہ السّلام جو یزید کے ہاتھوں شہید ہوئے اور کتابوں میں قرآن کریم جس کی تفسیر یہ صاحب لکھنا چاہتے ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو اس تفسیر کے متعلق کیا کہتے جو میرزا بشیر الدین محمود (خلیفۂ جماعتِ قادیان) نے شائع فرمائی ہے۔ جب کوئی شخص اپنا ایک خاص خیال اور مسلک لیکر قرآن کی طرف جاتا ہے تو اس کا نتیجہ قرآنی الفاظ میں۔ الحاد کے سوا اور کیا نکل سکتا ہے۔ قرآن کریم سے ہدایت اُسے مل سکتی ہے جو بالکل خالی الذہن ہو کر اس سے ہدایت طلب کرے اور جو کچھ اس بارگاہِ علم و بصیرت سے عطا ہو اُسے بلا تامل قبول کرلے۔ آیات قرآنی میں کھینچ تان کر کے اُنھیں اپنے خاص مقصد کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرنا۔ قرآن سے (معاذ اللہ) استہزا۔ اور خدا سے بغاوت کا مرادف ہے۔

قادیانی تفسیر میں بڑی جرأت سے کام لیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ جہاں اور کوئی چارہ کارگر نہیں ہوا وہاں قرآن کی تفسیر خوابوں کی تعبیر کے اصول پر کر دی گئی ہے۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ بازار میں ایسی کتابیں ملتی ہیں جن میں لکھا ہوتا ہے کہ اگر خواب میں فلاں چیز نظر آئے تو اُس کی تعبیر کیا ہوتی ہے۔ اس قسم کی ایک کتاب (تعطیر الانام) ہمارے مفسر کے سامنے ہے۔ جہاں انھیں قرآنی مفہوم کو اپنے مطلب کے مطابق پیش کرنے میں دقت آتی ہے وہاں جھٹ سے اس کتاب سے مدد لے لیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ خوابوں کی تعبیر کی رُو سے اس لفظ کے یہ معنی ہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ میرزا صاحب نبی تھے۔ اللہ اکبر! خوابوں کی تعبیر جیسے سرتا پا قیاسی علم کی رُو سے قرآن کریم جیسی حقیقتِ ثابتہ کی تفسیر صرف قادیان سے ہی شائع ہو سکتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کا ایک نظام سامنے نہ ہو۔ قرآن کریم سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا۔ اس نظام کا سنگِ بنیاد یہ ہے کہ نبی اکرمؐ کو خاتم النبیین

تسلیم کیا جائے اور اُسی زندگی کو اسلامی قرار دیا جائے جو ضابطۂ قانونِ خداوندی کے ماتحت بسر ہو۔ جو شخص انسانی ضوابطِ قوانین کے ماتحت زندگی بسر کرے پر مطمئن ہو جائے وہ مسلمان نہیں قرار دیا جا سکتا۔ چہ جائیکہ نبی تسلیم کیا جائے۔

با دمے ترسیدی خدا چہ می جوئی

ہم اس تفسیر کے ذکر میں اُلجھنا نہیں چاہتے تھے کہ ــــ فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں۔ لیکن زیر نظر رسالہ کی وجہ سے اس کا ذکر ناگزیر ہو گیا۔ جو مشہور مناظر جناب ابو الوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری نے اس تفسیر پر تنقیدی نظر سے لکھا ہے اور اپنے مناظرانہ رنگ میں اُس کی چند ایک غلطیوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ فنی اعتبار سے یہ کوشش کامیاب ہو تو ہو۔ لیکن قرآنی غلطیوں پر تنقید کے خیال سے کوشش کامیاب نہیں۔ بلکہ سطحی ہے۔ مناظر زیادہ تر الفاظ کے اُتار چڑھاؤ میں اُلجھا رہتا ہے۔ حقائق سے کم بحث کرتا ہے۔ بہرحال جو لوگ اس قسم کی مناظرانہ کشاکش سے دلچسپی رکھتے ہیں اُن کے لئے یہ رسالہ مفید ہو گا۔ رسالہ معمولی لکھائی چھپائی کے ۴۳ صفحات پر مشتمل ہے اور ۳ر میں جناب مؤلف سے مل سکتا ہے۔

۲۔ ممالکِ اسلامیہ کی سیاست

مرتبہ جناب عشرت حسین صاحب صدیقی۔ بی۔ اے
ضخامت قریب دو سو پچاس صفحات۔ طباعت و کتابت واجبی۔ قیمت فی نسخہ مجلد ایک روپیہ آٹھ آنہ
شائع کردہ:۔ مکتبہ جامعہ۔ دہلی۔

اُردو زبان میں اسلامی ممالک کی سیاست پر بہت کم کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ زیر نظر کتاب میں اس موضوع پر کچھ مواد موجود ہے۔ لیکن واقعات پر پوری طرح روشنی نہیں ڈالی گئی اور ایک مختصر کتاب میں ان تفاصیل کی گنجائش بھی نہ تھی۔ شروع میں تمام ممالک اسلامیہ پر الگ الگ تبصرہ ہے۔ اور اخیر میں یہ تین عنوان ہیں۔ ۱۔ اسلامی ممالک اور یورپین حکومتیں۔ ۲۔ اتحاد اسلام اور اتحادِ عرب۔ ۳۔ اسلامی ممالک اور موجودہ جنگ۔ کتاب کو اگر وقائع نگاری تک محدود رکھا جاتا تو اچھا تھا۔ لیکن مؤلف نے اس میں اپنے نظریات کو سامنے رکھا ہے۔ جس سے کتاب قومیت پرستی (نیشنلزم) کی مبلغ بن گئی ہے اگر مؤلف کے ذاتی رجحان سے قطع نظر کر لی جائے تو کتاب سے اچھی معلومات فراہم ہو سکتی ہیں۔

۳- قومیت اور بین الاقوامیت

مرتبہ محمد قاسم حسن صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔

ضخامت ایک سو ساٹھ صفحات۔ طباعت و کتابت اطمینان بخش۔ قیمت مجلد ایک روپیہ۔

یہ کتاب بھی مکتبہ جامعہ ملیہ کے پانچ سالہ پروگرام کے سلسلہ میں ہے۔ مسئلہ قومیت اور بین الاقوامیت پر تفصیلی بحث ہے جو لوگ اس مسئلہ کے ماتحت کچھ ابتدائی معلومات چاہتے ہیں۔ اُن کے لئے یہ کتاب مفید ہوگی "متحدہ قومیت" کا پرچار اس میں بھی مؤلف کے سامنے ہے

۴- بحرالکاہل کی سیاست

مرتبہ جناب امین خالدی۔ ضخامت قریب دو صد صفحات۔ قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنہ

یہ کتاب بھی جامعہ کے پنج سالہ پروگرام کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ جو لوگ بحرالکاہل کی سیاست اور مشرق بعید کے ممالک مثلاً چین۔ جاپان۔ جزائر فلپائن۔ مجمع الجزائر غرب الہند۔ ملایا وغیرہ کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کے لئے یہ کتاب مفید ہے۔ ضمیموں اور نقشہ جات سے اسکی افادی حیثیت اور بھی زیادہ ہوگئی ہے۔

۵- ناتسیّت

مرتبہ شاہ حسین رزاقی ایم۔ اے (عثمانیہ) ضخامت پونے دو سو صفحات۔ کتابت، طباعت اچھی۔ قیمت مجلد ایک روپیہ۔

یہ اُن انعامی مقالات میں سے ایک مقالہ ہے جن کے لکھوانے کے متعلق مکتبہ جامعہ کے اربابِ حل و عقد نے اپنے پنجسالہ پروگرام میں ذکر کیا تھا۔ اسمیں تحریک "نازی ازم" یا ناتسیت کی ابتدا اور اس کے جرمنی پر اثر پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے اور اس تحریک کا وقت کی دوسری تحریکوں سے مقابلہ کیا گیا ہے۔ اکثر سمجھا جاتا ہے کہ ناتسیت ہٹلر کی پیداوار ہے۔ لیکن اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ یہ غلط ہے۔ بلکہ ہٹلر خود ناتسیت کی پیداوار ہے اور حکومت و معاشیات کا یہ نظریہ دراصل ایک ارتقاء کا نتیجہ ہے

ناتسیت کے متعلق معلومات حاصل کرنے والوں کے لئے کتاب مفید ثابت ہوگی۔

تفسیر سورۂ فیل

۵۱۔ نور جہاں روڈ

(اعتراض اور اس کا جواب)

محترمی اخوندزادہ صاحب۔ سلام مسنون۔ ستمبر کے طلوع اسلام میں "سلیم کے نام خط" میں میں نے ضمناً سورۂ فیل کی تفسیر کے ایک گوشہ کی طرف توجہ دلائی تھی۔ اس کے متعلق ایک صاحب نے کچھ اعتراضات میرے پاس بھیجے ہیں۔ چونکہ ان کی نوعیت ایسی ہے کہ جن حضرات کی نگاہ سے میری توجیہات گذری ہیں ان کے لیے ان اعتراضات اور ان کے جواب سے مطلع ہونا فائدہ سے خالی نہیں۔ اس لیے میں جناب معترض کا خط اور اپنا جواب بغرضِ اشاعت بھیج رہا ہوں۔ امید ہے آپ آئندہ اشاعت میں درج فرما کر شکر گذار فرمائیں گے۔

والسلام پرویز ۲۰ ستمبر ۱۹۴۱ء

۷۸۶

شفاخانہ دیوبند

۹ ستمبر ۱۹۴۱ء

بھائی صاحب۔ سلام مسنون۔ ستمبر کے طلوع اسلام میں آپ کا جو خط سلیم کے نام شائع ہوا ہے۔ اس میں جناب نے سورۂ فیل کی تفسیر جدید توجیہ کے ساتھ کی ہے۔ اسے دیکھ کر حسب ذیل خدشات پیدا ہو گئے ہیں۔ امید کہ جناب بواپسی ڈاک ان کو رفع فرما کر سلیم کی اور ناظرین طلوع اسلام کی جو سلیم کے نام کا خط پڑھنے پر مجبور کیے جاتے ہیں تسلی فرما دیں گے۔

سورہ مذکور کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے اگر غلط ہو تو مطلع فرمائیے گا:۔

"کیا نہیں دیکھا کہ کیا کیا تیرے رب نے اصحاب فیل کے ساتھ؟ کیا نہیں کر دیا ان کی خفیہ تدبیر کو رائگاں؟ اور بھیجے ان کے اوپر پرند جھنڈ کے جھنڈ۔ مارتے تھے ان کو پتھر کنکر سے پس کر دیا ان کو مانند کھائے ہوئے بھوسے کے"

ظاہر ہے کہ لفظ "رَبُّكَ" بصیغۂ واحد حاضر استعمال ہوا ہے "رَبُّكُمْ" جمع میں نہیں ہے یعنی تخاطب تنہا رسول سے ہے کسی جماعت سے نہیں ہے۔ اب اگر آپ "ترمیھم" میں ترمی کا فاعل "طَيْرًا اَبَابِيْل" کو نہیں سمجھتے تو 'تم' بصیغۂ جمع کو 'ترمی' کا فاعل کسی زبان کی قواعد کے رو سے قرار دیتے ہیں۔ اگر عبارت بسبق میں تخاطب ہی میں جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہوتا تو بھی آپ ایسی زبردستی کر سکتے تھے۔ لیکن بصورت موجودہ تو جناب کی یہ اپج اسی نوع کی معلوم ہوتی ہے جس پر طلوع اسلام میں مولانا ابوالکلام کو مورد الزام ٹھہرایا گیا ہے۔

برائے خدا انداز بیان پر غور فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو مخاطب کر کے بطور اظہار احسان اپنے انعام کا تذکرہ فرماتا ہے اور طیرًا ابابیل کے باب میں لفظ 'ارسل' استعمال ہوتا ہے یعنی بھیجے تیرے رب نے طائر جھنڈ کے جھنڈ جنھوں نے اصحاب فیل پر پتھر کنکر برسا کر انھیں تباہ کر دیا اور اپنی توجیہ کو دیکھئے کہ پرند خود بخود فوجوں کے ساتھ ہو جایا کرتے تھے اور 'تم' (نہ معلوم یہ تم اس عبارت میں کہاں سے اور کیسے گھس آیا) نے اصحاب فیل کو مار کر بھس کر دیا اور سوچئے کہ کیا آپ کی اس توجیہ سے سورۂ فیل کی زوردار عبارت خواہ مخواہ کا احسان ہو کر نہیں رہ جاتی اور نعوذ باللہ کیا اس سے اللہ میاں کا چھچھورا پن ظاہر نہیں ہوتا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ خدا کو مافوق العادت۔ افعال پر قادر سمجھنے سے جھجکتے ہیں اور اس کو قادر مطلق فعال لما یرید۔ علیٰ کل شیئٍ قدیر۔ جیسا کہ ان الفاظ کے سادہ معنوں سے ظاہر ہے نہیں ماننا چاہتے ہیں۔

قیاس کنی زگلستان من بہار مرا۔ کے اصول پر خیال ہوتا ہے کہ معارف میں بھی جناب نے ثعبان موسیٰ و حرق نمرود وغیرہ کے متعلق ایسی ہی توجیہات یا تحریفات روا رکھی ہوں گی۔ ایسی صورت میں مولویوں پر الزام فضول ہے۔ وہ بھی اور کچھ نہیں کرتے۔

اس قسم کا لٹریچر حضرت نیاز وغیرہ کی عنایتوں کے باعث اسلام میں پہلے ہی سے موجود ہے آپ کا اضافہ عام مسلمانوں کی مزید پریشانی کا موجب ہوگا۔

معارف القرآن کی خریداری کا شوق سرد ہو گیا ہے۔ چند اور احباب بھی جو اس کے دیکھنے کے متمنی تھے ڈر گئے اور خیال کرتے ہیں کہ کہیں مزید ذہنی الجھن میں گرفتار ہو کر اپنے عقائد خراب کریں

اللہ سب کچھ کر سکتا ہے اس کے ماننے میں کیا نقصان ہے بلکہ بعض کی یہ رائے ہے کہ عنقریب آپ کی جماعت علامہ مشرقی کو پیغمبر اور آپ یعنی پرویز صاحب کو خلیفہ مان کر پنجاب میں غلام احمد قادیانی کی مثال کی از سر نو تجدید کرے گی جواب کا منتظر ہوں امید کہ جلد ارسال فرما کر ممنون فرمائیگا۔

نیازمند۔ احمد اللہ خاں میڈیکل افسر دیوبند۔

محترمی ڈاکٹر صاحب۔ سلام مسنون۔ گرامی نامہ مورخہ ۹ ستمبر باعث نوازش ہوا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے میری توجیہات کا غور سے مطالعہ فرمایا اور ان پر جو خدشات وارد ہوئے ان سے مجھے متنبہ کیا۔ آپ کے اعتراضات سے میرے اس اطمینان کو مزید تقویت مل گئی کہ بحمدہٖ میری توجیہہ غلط نہیں ہے۔

آپ کے اعتراض کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ الم تر۔ ربک۔ اور ترمی واحد کے صیغے ہیں انہیں جمع مخاطب کے صیغہ میں کیسے لیا جا سکتا ہے؟ سورہ زیر نظر کا ترجمہ کرتے ہوئے میں نے خود حاشیہ میں لکھا ہے۔

"یہ بحث تفصیل طلب ہے کہ واحد مخاطب کے صیغہ سے مراد جمع مخاطب کیسے لی گئی ہے لیکن ہے یہ قاعدہ کے مطابق" (طلوع اسلام۔ بابت ستمبر۔ صفحہ ۵۹ فٹ نوٹ)

سو آپ کا اعتراض "فقط اتنا ہے کہ اس اجمال کی تفصیل کیا ہے؟

سب سے پہلے غور طلب بات یہ ہے کہ الم تر (کیا نہیں دیکھا تو نے) میں مخاطب کس سے ہے؟ آپ فرماتے ہیں کہ اس میں رسول اللہ صلعم مخاطب ہیں۔ یعنی حضورؐ سے ارشاد ہے کہ "اے رسول! کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے اصحاب فیل کے ساتھ کیا کیا؟" بہت اچھا۔ میں مان لیتا ہوں کہ الم تر کا فاعل "رسول" ہے تو جو فاعل الم تر کا ہے وہی ترمی کا ہے اس پر گرامر کے قواعد کے لحاظ سے کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا! الم تر بھی صیغہ واحد مخاطب مذکر ہے اور ترمی بھی۔ اس لئے جو فاعل الم تر کا ہے وہی ترمی کا ہے۔ لہذا ترجمہ یوں ہوا۔

"کیا نہیں دیکھا تو نے (اے رسول) کہ کیا کیا تیرے رب نے اصحاب فیل کے ساتھ۔ کیا نہیں

کر دیا ان کی خفیہ تدابیر کو رائگاں ؟ اور بھیجے ان کے اوپر پرند جھنڈ کے جھنڈ تو پھینکتا تھا
ان پر پتھر ....."

اس پر اعتراض یہ پڑتا ہے کہ حضور نے تو ان پر پتھراؤ کیا نہیں تھا (اس لئے کہ یہ واقعہ حضور کی ولادت سے پہلے کا ہے) اس لئے ترمی کا فاعل رسول نہیں ہو سکتا۔ اس مشکل کو اس طرح رفع کیا گیا کہ الم تر کا فاعل تو رسول ہے لیکن ترمی کا فاعل طیر ہے۔ جب طیر (چڑیوں) کو ترمی کا فاعل قرار دیا گیا تو پھر اس کی بھی کوئی صورت نکلنی چاہیئے تھی کہ چڑیوں نے کیسے پتھراؤ کیا جس سے ہاتھیوں والی فوج بھس بن کر رہ گئی اس مشکل کا حل یوں پیش کیا گیا کہ وہ چڑیاں اپنے پنجوں اور چونچ میں کنکریاں اٹھاتی تھیں۔ کنکری سوار کے سر میں لگ کر ہاتھی کے پیٹ سے نکل جاتی تھی اس طرح وہ فوج بھس بن کر رہ گئی۔

میں نے یہ عرض کیا ہے کہ اس سورۂ مقدسہ میں جو فاعل الم تر کا ہے وہی ترمی کا ہے اور الم تر میں تخاطب رسول سے نہیں بلکہ اہل مکہ یا قریش سے ہے اگر اس کا ترجمہ واحد مخاطب کے ساتھ کیا جائے تو کہا جائے گا کہ

"(اے مکی یا جماعت قریش کے فرد!) کیا نہیں دیکھا تو نے کہ تیرے رب نے اصحاب فیل کے ساتھ کیا کیا تھا؟ ..... تو نے ان پر پتھراؤ کیا ....."

اور اگر یہ سمجھا جائے کہ ایک فرد کی وساطت سے تمام جماعت کو مخاطب کیا گیا ہے تو کہا جائے گا

"(اے اہل مکہ۔ یا اے قریش!) کیا نہیں دیکھا تم نے کہ تمہارے رب نے .....
تم نے ان پر پتھراؤ کیا ....."

میں نے اس مفہوم کو ترجیح دی ہے۔ قرآن کریم میں متعدد مثالیں موجود ہیں جن میں تخاطب واحد کے صیغہ میں ہے لیکن مفہوم جمع ہے دو ایک عرض کئے دیتا ہوں

سورۂ ابراہیم میں فرمایا۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ

کیا نہیں دیکھا تو نے کہ اللہ نے زمین اور آسمان کو حق کے ساتھ پیدا کیا۔ اگر وہ چاہے تو تمہیں

وَيَاتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝ ۱۹/۱۴

لے جائے اور لے آئے نئی خلقت ۔

الم تر واحد مخاطب ہے اور یذھبکم کی ضمیر جمع مخاطب کی ہے ۔ اس لئے اگرچہ الم تر میں تخاطب ایک فرد سے ہے لیکن مراد پوری نوع ہے ۔

سورۂ حج میں ہے ۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۲۲/۶۵

کیا نہیں دیکھا تو نے کہ اللہ نے مسخر کر دیا واسطے تمہارے جو کچھ زمین میں ہے اور کشتیوں کو کہ جو اس کے حکم سے دریا میں چلتی ہیں .....

الم تر واحد کا صیغہ ہے اور اس کے بعد لکم کی ضمیر جمع مخاطب کی ہے ۔ اس لئے الم تر سے بھی جمع مخاطب ہی مراد ہے ۔

سورۂ فرقان کا پانچواں رکوع " اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ " (کیا نہیں دیکھا تو نے اپنے رب کی طرف) سے شروع ہوتا ہے اور اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا ..... (اور اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے رات کو لباس بنایا) ۔

عدم گنجائش مانع ہے ۔ ورنہ اس قسم کی بیسیوں آیات پیش کی جا سکتی ہیں جن میں تخاطب واحد سے ہے لیکن مراد جمع ہے اس کے برعکس سورۂ بقرہ کے تیرھویں رکوع میں دیکھئے ۔ ابتدائے کلام میں تخاطب جمع ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا (اے لوگو جو ایمان لائے ہو مت کہو راعنا) اور اس کے بعد اس سلسلہ میں ہے اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝ (کیا تو نہیں جانتا کہ زمین اور آسمان کی بادشاہت اللہ ہی کے لئے ہے ۔ اور تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی دوست اور مددگار نہیں) غور فرمائیے ۔ ابتدا میں تخاطب جمع سے ہے درمیان میں الم تعلم واحد کا صیغہ ہے اسکے بعد لکم میں پھر ضمیر جمع کی استعمال کی گئی ہے ۔ اس قسم کی بھی کئی ایک مثالیں قرآن

کریم میں موجود ہیں۔

ان مثالوں سے آپ نے غور فرمالیا ہوگا کہ واحد مخاطب کے صیغہ سے جمع مراد لے لینا میری "اپج" نہیں ہے۔ قرآن کریم کا اسلوب ہے۔ نہ ہی یہ "زبردستی" ہے بلکہ قرآن ہی کے قاعدہ کی اتباع ہے اس لئے میرے نزدیک الم تر (سورۂ فیل) میں اگرچہ خطاب واحد سے ہے لیکن قرآن کریم کے اسلوب کی رُو سے مراد جمع ہے یعنی اہل مکہ یا قریش اور انہی کے لئے میں نے اپنے ترجمہ میں تم کا لفظ لکھا ہے۔

لیکن اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ الم تر (سورۂ فیل) میں تخاطب رسول سے ہے تو بھی اس سے مفہوم جمع ہی ہے یعنی رسول کی وساطت سے اہل مکہ یا قریش کو مخاطب کیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں اس کی بھی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ تخاطب رسول سے ہے لیکن اس سے مراد عام تخاطب ہے۔ مثلاً سورۂ طلاق کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۶۵/۱

اے نبی! جس وقت طلاق دو تم عورتوں کو پس طلاق دو تم ان کو ان کی عدت کے وقت اور گنو تم عدت کو اور ڈرو اللہ اپنے رب سے۔

خطاب واحد ہے۔ مخاطب نبی ہے لیکن اس کے بعد تمام صیغے جمع مخاطب کے ہیں اور جمع کے صیغوں کے بعد آیت کے اخیر میں ہے۔

لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰهَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ۝ ۶۵/۱

نہیں جانتا تو کہ اللہ پیدا کر دے پیچھے اس کے کوئی بات

یہاں پھر واحد مخاطب کا صیغہ ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان تمام احکام کا تخاطب عام ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔ تیسرا رکوع یوں شروع ہوتا ہے۔

وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا یَبْلُغَنَّ

عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ ۱۷/۲۳

اور تیرے رب نے حکم کیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبودیت اختیار نہ کرو۔ اور ماں باپ سے احسان کرنا۔ اگر تیرے سامنے ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اُف نہ کہ یعنی انھیں مت جھڑک اور ان سے تعظیم سے بات کر۔

دیکھیے۔ تخاطب واحد سے ہے (ربک) لیکن اس کے لئے فعل (تعبدوا) جمع کے صیغہ میں ہے۔ پھر عندک کی ضمیر واحد کی ہے اور اس کے بعد کے افعال بھی واحد ہیں لیکن ان کے بعد ربکم (۱۷/۲۵) میں ضمیر جمع کی ہے۔ ظاہر ہے کہ (وقضیٰ ربک) میں نبی اکرمؐ سے خاص تخاطب نہیں بلکہ حضور پر تو اس حکم کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ حضورؐ کے والدین تو بہت پہلے انتقال کر چکے تھے۔ اس لئے ربک میں تخاطب عام ہے اس لئے تعبدوا میں جمع کا صیغہ ہے۔ پھر واحد کے صیغوں سے بھی مراد جمع ہی ہے جیسا کہ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ۱۷/۲۵ سے ظاہر ہے۔ اسی سورہ میں ذرا آگے جا کر ایک اور آیت ہے جس میں یہ مفہوم اور بھی نمایاں طور پر سامنے آگیا ہے۔ فرمایا۔

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۭ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝ ۱۷/۳۹

یہ حکمت کی ان باتوں میں سے ہے جو تیرے رب نے تیری طرف وحی کیا ہے اور اللہ کے ساتھ دوسرا معبود مت ٹھہرا کہ تو دوزخ میں ڈالا جائے ملامت کا مستوجب اور ٹھکرایا ہوا

اس میں مخاطب واحد ہے اور آیت کے پہلے حصہ سے ظاہر ہے کہ تخاطب خود رسولؐ سے ہے لیکن آیت کے دوسرے حصہ میں مخاطب واحد نہیں ہو سکتا۔ رسولؐ کی وساطت سے عام تخاطب ہے۔

گذشتہ سطور سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ قرآن کریم میں ایسی مثالیں موجود ہیں جن میں

(۱) واحد مخاطب سے مراد جمع مخاطب ہے اور

(۲) رسولؐ کو مخاطب کر کے حکم عام دیا گیا ہے اس لئے رسولؐ سے تخاطب بھی عام تخاطب ہے۔

اس لئے سورۂ فیل میں اگر الم تر کا فاعل ایک مکی یا قریشی لیا جائے تو بھی اس سے مراد تمام جماعت (اہل مکہ یا قریش)

ہے اور اگر اس کا فاعل رسول لیا جائے تو بھی تخاطب عمومی ہے ان دونوں صورتوں میں مخاطب وہ طبقہ ہے جو اس وقت سامنے تھا۔ لہٰذا ترکی کا فاعل بھی وہی طبقہ (یعنی اہل مکہ یا قریش) ہے قریش سے تخاطب دو نہج سے ہو سکتا ہے یا تو انھیں زجر و تنبیہ کی گئی ہے کہ تم اپنی قوت کے گھمنڈ پر رسولؐ اور (بظاہر) کمزور مسلمانوں کی مخالفت کرتے ہو حالانکہ تم نے ابھی کل ہی خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ اتنی بڑی قوت کے مالک (ابرہہ) سے خدا نے کیا کیا؟ اس نہج کی تائید اس سورہ سے پہلی سورہ کے مضمون سے ہوتی ہے۔ دوسرا قرینہ یہ ہے کہ (جیسا کہ میں نے لکھا ہے) قریش سے یہ کہا گیا ہے کہ تمہیں یہ خوف نہیں ہونا چاہیے کہ اسلام لانے سے ملحقہ قومیں ہجوم کر کے تمہیں برباد کر دینگی تم نے دیکھا ہے کہ رب کعبہ نے ابھی کل ہی اپنی نصرت سے کس طرح اپنے گھر کی حفاظت کی تھی! اس کی تائید اس سورہ کے بعد کی سورہ کے مضمون سے ہوتی ہے۔

یہ ہیں مختصراً میری گذارشات اس توجیہ کے متعلق آپ کے خط میں باقی باتیں نفس موضوع سے غیر متعلق ہیں۔ اس لیے ان کے متعلق کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھتا۔ البتہ اتنا واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اللہ تعالیٰ کو قادرِ مطلق۔ فعال لما یرید۔ علیٰ کل شیئٍ قدیر مانتا ہوں اور ان معجزات پر جن کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔ ایمان رکھتا ہوں۔ البتہ اس چیز کو جائز نہیں قرار دیتا کہ ایک سیدھی سی بات کو جسے قرآن کریم معجزہ نہ بتائے خواہ مخواہ چیستاں بنا دیا جائے۔ میرے نزدیک اللہ کی نصرت خواہ وہ کیسے ہی عادی طریق سے کیوں نہ آئے۔ اس کی آیات (نشانیوں) میں سے ہے بارش کو کسی غیر عادی یا مافوق الفطرت چیز سے لیکن جو بارش بدر کے میدان میں ہوئی تھی وہ نصرت انیزدی کے سحاب کرم کو ساتھ لے کر آئی تھی۔ یوں ہی اتفاقیہ نہیں ہو گئی تھی۔ واقعہ اصحاب فیل میں بھی قریش کے ساتھ خدا کی نصرت شامل تھی۔ اسی لیے میں نے لکھا تھا کہ "مشیت کا منشا اہل مکہ کو بچانا تھا۔" جس خدا نے یہ انتظام کر دیا۔ کہ اسی مہیب فوج کی خفیہ تدبیریں خاک میں ملا دے ....." (طلوع اسلام۔ بابت ستمبر ص ۵۹-۵۸)

خدا کی نصرت کے لیے ضروری نہیں کہ وہ خرقِ عادت کے طریق پر ہی ظہور پذیر ہو۔ چنانچہ بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ ابرہہ کی فوج میں چیچک کا مرض نمودار ہو گیا تھا اس لیے پتھراؤ کے علاوہ یہ چیز بھی ان کی تباہی کا باعث بن گئی۔ یہ بھی درست ہو سکتا ہے لیکن چونکہ قرآن کریم نے اس کا ذکر نہیں کیا اس لیے میں نے بھی اس کا تذکرہ ضروری

نہیں سمجھا تھا۔ اگر قریش کی مدد کرنا اللہ کو منظور نہ ہوتا تو وہ ان پرندوں کو فوج پر اڑنے سے روک دیتا گیا آپ سمجھتے ہیں کہ پرندے اس کی مشیت کے بغیر اڑ کر آ سکتے تھے؟ پھر یہ بھی اسی کی مشیت سے تھا کہ ابرہہ کو یہ سوچا ہی نہیں کہ اس کی خفیہ تدبیر کس طرح پردہ دری ہو رہی ہے۔ کیدہم کے لفظ پر غور فرمائیے سورت کا عمود ابرہہ کے کید (خفیہ تدبیر) کو رائیگاں کر دیتا ہے۔ طاقت کو منتشر کر دینا نہیں اگرچہ اس کی خفیہ تدبیر کے رائیگاں جانے کا عملی نتیجہ اس کی طاقت کا ملیا میٹ ہو جانا ہی تھا اور آپ نے روایات میں یہ بھی دیکھا ہو گا کہ ان پرندوں کے بڑے بڑے سر لمبی لمبی سونڈ نما چونچیں اور شکاری کتوں کے پنجوں جیسے چنگل تھے اور وہ لاشوں پر گر کر ان کا گوشت کھاتی تھیں۔ غور فرمائیے کہ ان قرائن سے کس طرح صحیح واقعہ کی شہادت ملتی ہے۔ باقی رہیں دوسری قسم کی روایتیں تو ان کے متعلق امام ابن جریر نے خود لکھا ہے کہ اس باب میں روایات گڈمڈ ہو گئی ہیں اور اس کی وجہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔

چونکہ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ آپ کے اعتراض کا جواب دے کر "ناظرین طلوع اسلام کی تسلی" کر دوں اس لئے اس خط کو مع آپ کے خط کے۔ مدیر طلوع اسلام کے پاس بغرض اشاعت بھیج رہا ہوں۔

والسلام

پرویز ۵ نور جہاں روڈ۔ نئی دہلی

اعتراض اور اس کا جواب قارئین کے سامنے ہے۔ جناب پرویز صاحب کا جواب کسی اضافہ کا محتاج نہیں۔ البتہ جناب معترض کے گرامی نامہ میں دو ایک باتیں ایسی ہیں جن کا جواب ہمارے ذمہ لازم ہے۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ "ناظرین طلوع اسلام" سلیم کے نام کا خط پڑھنے پر مجبور کئے جاتے ہیں" ہم عرض کریں گے کہ اگر "سلیم کے نام خطوط" کی اشاعت کوئی جرم ہے تو اس جرم کے ہم ذمہ دار ہیں نہ کہ مضمون نگار صاحب۔ ہمارے مضامین نگار حضرات اپنے مضامین ہمارے پاس بھیجتے ہیں اور ہم انھیں قارئین تک پہنچاتے ہیں۔ طلوع اسلام اپنی روشِ خاص میں اپنے جنون کا پابند ہے اس لئے جناب معترض نے جو شکایت فرمائی ہے ہم اس باب میں بھی اپنی روش واضح کر دینا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص سال بھر کے لئے رسالہ کا خریدار بنتا ہے تو دادوستد کے عام قواعد کی رُو سے سال بھر میں جو کچھ پیش کیا جائے گا اسے قبول کرنا ہو گا۔ شاداً یا بہ زیستن ناشاد یا بہ زیستن لیکن ہم اسے کبھی پسند نہیں کرتے کہ

قارئین طلوع اسلام، رسالہ کو "لزومِ عدم" کی مجبوری سے پڑھتے رہیں۔ ہماری روش یہ ہے کہ سال بھر میں جس وقت آپ دیکھیں کہ طلوع اسلام کی آمد آپ کی طبیعت پر ناگوار گذرتی ہے اسی وقت ہمیں اطلاع دیدیجئے۔ رسالہ بند کر دیا جائے گا اور آپ کا بقایا چندہ واپس کر دیا جائے گا۔ ہماری نگاہ میں طلوع اسلام اور اس کے قارئین کے تعلقات "دکاندار و خریدار" کے نہیں بلکہ اس سے بہت بلند ہیں۔ یہی اچھا ہوا کہ جناب ڈاکٹر صاحب نے ابھی معارف القرآن کا نسخہ خرید نہیں فرمایا تھا ورنہ دنیا اور آخرت دونوں میں نقصان اٹھانا پڑتا۔ دنیا میں اضاعتِ مال سے اور آخرت میں اعتقادات کی خرابی کی وجہ سے۔

دوسری چیز وہ ہے جس کے احساس سے ہماری آنکھیں ہمیشہ نمناک اور جگر فگار رہتا ہے مسلمان کی آج حالت یہ ہو چکی ہے کہ وہ جس روش پر چلا آ رہا ہے اگر اس سے ہٹ کر کوئی بات اس سے کہی جائے تو وہ اسے سننے کی تاب نہیں لاتا۔ غم و غصہ میں اپنے حواس پر قابو نہیں رکھ سکتا اور آتش زیر پا ہو کر "مہذب اور غیر مہذب" گالیوں تک اتر آتا ہے حالانکہ قرآن کریم بار بار اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ تم خود غور و تدبر کرو۔ یہ ضروری نہیں کہ جس راہ پر تمہارے اسلاف چلتے آ رہے ہوں، وہی راہ صواب ہو۔ ان سے غلطی کا بھی امکان ہے۔ مسئلہ زیر نظر پر غور فرمائیے۔ بات صرف اتنی تھی کہ جناب پرویز نے ترقی کا فاعل وہی قرار دیا ہے جو الم تر کا فاعل ہے۔ آپ کو اس سے اختلاف کی ہر وقت اجازت ہے۔ آپ اختلاف کیجئے۔ اعتراض کیجئے۔ اپنے خدشات واضح کیجئے۔ لیکن مجیب کے خلاف ڈگری صادر کر دینے سے پیشتر اس کی سن تو لیجئے۔ جناب معترض کا اعتراض، جیسا کہ جواب میں لکھا گیا ہے۔ اسلوبِ قرآن سے ناواقفیت کی بنا پر تھا لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے گرامی نامہ میں کس غیظ و غضب سے کام لیا ہے۔ محض اس لئے کہ جناب پرویز کی توجیہ سے انہیں اختلاف ہے! یہ صرف جناب معترض تک ہی محدود نہیں بلکہ بالعموم مسلمانوں کی آج یہی حالت ہو رہی ہے اور اس لئے ہمیں بڑے کرب و تأسف سے اس کی طرف اشارہ کرنا پڑا ہے۔ امید ہے جناب معترض ہماری اس گذارش پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔ (طلوع اسلام)

جدت

ہفتہ میں دو بار — مراد آباد

جدت ہندوستان کا بہترین سستا اور کثیر الاشاعت اخبار ہے

اسکی خریداری کیلئے مسٹر محمد علی جناح، مسٹر فضل الحق وزیر اعظم بنگال۔ آنریبل سر سکندر حیات خان وزیر اعظم پنجاب۔ راجہ صاحب محمود آباد و دیگر لیڈران مسلم لیگ نے زبردست اپیلیں شائع کی ہیں

جدت دلکش نظموں بہترین جنگی تبصروں بلند پایہ افسانوں کا مجموعہ اعلیٰ سیاسی مضامین کا گنجینہ اور جنگ کی تازہ ترین خبروں کا خزینہ ہے۔

یہ اخبار پہلے ہفتہ وار تھا۔ یہ اخبار نیا نہیں ہے بلکہ پرانا ہے اسکی تیرھویں جلد ہے اس اخبار کی ایڈیٹری کیلئے ملک کے ایک ایسے مایۂ ناز اہل قلم وانشاپرداز گریجوٹ کی خدمات حاصل کی گئی ہیں جو کئی روزانہ اخبارات کو ایڈٹ کر چکے ہیں۔

جدت کی قیمت ہم نے باوجود گرانی کاغذ وغیرہ کے بجائے چھ روپیہ کے صرف پانچ روپیہ سالانہ اور ۱۲؍ ششماہی اور عہ؍ سہ ماہی مقرر کی ہے۔ شائقین اصحاب فوراً قیمت روانہ فرما کر جاری کرالیں ایجنٹ صاحبان کو پچیس فیصدی کمیشن دیا جاویگا۔ چونکہ یہ اخبار بوجہ علمبرداری لیگ کے کثیر الاشاعت ہے اسلئے مشتہرین کیلئے بہت منفعت بخش ہے

منیجر

اخبار جدت مراد آباد پرنس روڈ

دارُالعلوم دیوبند کا ماہانہ رسالہ

دارُالعُلوم

مدّت مدید سے مخلص اور دیندار مسلمان اپنے دینی وعلمی مرکز دارالعلوم دیوبند کی طرف سے ایک علمی ومذہبی رسالہ کے اجراء پر مصر تھے۔ الحمدللہ کہ اُن کی آرزو پوری ہوگئی اور بلا واسطہ دارالعلوم کی ملکیت اکابر علمائے دیوبند کی سرپرستی ونگرانی میں رسالہ "دارالعلوم" جاری ہوگیا

رسالہ کے معیار کی بلندی اور اسکی خوبیوں کا اندازہ صرف اس سے کیا جاسکتا ہے۔ کہ اس میں جماعتِ دیوبند کے جلیل القدر علما کے بیش قیمت مضامین مسلسل شایع ہونگے

رسالہ "دارالعلوم" کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ مسلمان جس صحیح اور قابلِ اعتماد مذہبی رہنمائی کی اُمید اپنے مذہبی مرکز "دارالعلوم دیوبند" سے رکھتے ہیں اُسے صرف یہی رسالہ پورا کرسکتا ہے۔

اس رسالہ کا کوئی تعلق کسی شخص کی ذات سے نہیں بلکہ براہِ راست دارالعلوم سے ہے۔ یہی اسکی ساکھ اور استحکام کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ مخلص اور دیندار مسلمانوں سے توقع ہے کہ وہ اس رسالہ کے معاونین میں شامل ہونا اپنا ایک ضروری جماعتی فریضہ تصور فرمائیں گے۔ کاغذ وغیرہ کی انتہائی گرانی کے باوجود سالانہ چندہ صرف دو روپیہ ہے۔ نمونہ مفت طلب فرمائیں۔ وی۔ پی طلب کرنیکی بجائے اپنا اور اپنے احباب کا چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں۔

عبدالوحید ناظم و مرتب
رسالہ "دارالعلوم" دیوبند

حمائلِ شریف

مکتبہ جامعہ کی طرف سے خاص رعایت

اس حمائل شریف کی کتابت محترمہ فاطمۃ الکبریٰ بنت جناب محمد دین صاحب خوشنویس کی ہے۔ موصوفہ کو ہندوستان کی سب سے بہتر عربی خوشنویس ہونیکی حیثیت سے مختلف انجمنوں اور نمائشوں کی طرف سے بہت سے طلائی تمغے ملے ہیں۔ بیگم صاحبہ بھوپال، اور اعلیٰ حضرت نواب صاحب حیدرآباد نے ہدیے اور وظائف پیش کئے ہیں۔ حمائل مترجم ہے۔ اور ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ کا ہے۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ہے

رمضان المبارک کے احترام میں مکتبہ نے حمائل شریف کے ہدیے میں خاص رعایت کردی ہے۔ یعنی بجائے ۳ے کے ۲ؔ کر دیا ہے۔ اُمید ہے کہ مسلمان اس رعایت سے فائدہ اُٹھائیں گے۔ محصولڈاک ۷ر

ملنے کے پتے

صدر دفتر مکتبہ جامعہ، قرول باغ، دہلی

شاخیں اور ایجنسیاں

۱۔ مکتبہ جامعہ، جامع مسجد دہلی ۲۔ مکتبہ جامعہ، لوہاری دروازہ لاہور ۳۔ مکتبہ جامعہ امین آباد لکھنؤ ۴۔ مکتبہ جامعہ، پرنسس بلڈنگ بمبئی ۲ ۵۔ سرحد بک ایجنسی، بازار قصہ خوانی، پشاور۔ ۶۔ کتب خانہ عابد شاپ، حیدرآباد۔ دکن۔

اسلامی معاشرت

نقشِ ثانی

(از جناب پرویز صاحب)

دیکھنے کو تو ایک چھوٹا سا پمفلٹ ہے۔ لیکن افادی حیثیت سے بڑی بڑی تصانیف پر بھاری ہے۔ مسلمانوں کی روزمرہ کی زندگی کس قسم کی ہونی چاہئے۔ اس کا ماحول کیسا ہونا چاہئے۔ اسکی عادات واخلاق کا خاکہ، اسکے رہنے سہنے کا ڈھنگ۔ اس کے تمدّن و معاشرت کے خط وخال۔ اسکی تعلیم وتہذیب۔ اسکے دنیاوی معاملات۔ اپنوں اور بیگانوں سے اس کے تعلقات۔ غرضیکہ اسکی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر انداز و اسلوب قرآنی آئینہ میں کیسا ہونا چاہئے۔ اِس چھوٹے سے پمفلٹ میں یہ سب کچھ آگیا ہے اور اس قدر سادہ اور دلنشین پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ ہر بات سیدھی دل میں اُتر جاتی ہے۔ اور لطف یہ کہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا گیا۔ بلکہ ہر چیز قرآن کریم کی چھوٹی چھوٹی آیات میں بیان کی گئی ہیں۔ بچوں کیلئے یہ پمفلٹ بہت ہی مفید ہے۔ اسلامی مدارس میں بطور نصاب کے داخل کر لیا جائے تو طلباء کے قلب و دماغ کی تعمیر صحیح اسلامی بنیادوں پر ہو جائے۔

قیمت چار آنے۔ محصول ایک آنہ

ادارہ طلوعِ اسلام دہلی

4240
رجسٹرڈ ایل نمبر

معاملہ کی ضروری باتیں

(۱) "طلوع اسلام" ہر انگریزی مہینے کی یکم کو التزاماً شائع ہوجاتا ہے اور نہایت احتیاط سے حوالہ ڈاک کیا جاتا ہے۔

(۲) رسالہ موصول نہ ہونیکی اطلاع زیادہ سے زیادہ دس تاریخ تک دیجئے۔ ورنہ بعد میں شاید پرچہ موجود نہ ہو۔ اور اگر موجود بھی ہوگا تو بلاقیمت نہ مل سکے گا۔

(۳) تبدیلی پتہ کی اطلاع ۲۵ تاریخ سے پہلے پہلے آجانی چاہئے۔

(۴) جس ماہ کی خریداری کا چندہ ختم ہوتا ہے اس مہینہ کے پرچہ کے اندر ایک اطلاع (جوابی کارڈ) رکھدیا جاتا ہے۔ جواب ایک ہفتہ کے اندر اندر آجانا چاہئے۔

(۵) چندہ سالانہ پانچ روپیہ مع محصولڈاک ہے۔ اور قیمت فی پرچہ (۸؍) چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجنے میں خریدار کو کفایت اور منتظمین کو سہولت رہتی ہے۔

(۶) ہر رقم موصولہ (خواہ وہ کسی ذریعہ سے موصول ہو) کی ایک رسید بھیجی جاتی ہے۔

(۷) وی۔پی طلب کرنے کے بعد اُسے وصول نہ کرنا ادارہ کو بلاجرم سزا دینے کے مرادف ہے۔

(۸) منی آرڈر کرتے وقت اپنا پتہ پورا اور صاف لکھئے۔ نیز رقم کی تفصیل بھی درج فرمائیے۔

(۹) آپ اپنا تعارف نمبر خریداری کے ذریعہ ہی کرا سکتے ہیں۔ اس لئے اس نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولئے ورنہ ہمیں بے حد دقت اور آپ کو ناواجب شکایت ہوگی۔

(۱۰) نمبر خریداری یاد نہیں رہا کرتا۔ کہیں نوٹ کر چھوڑیئے۔

(۱۱) "طلوع اسلام" کوئی تجارتی ادارہ نہیں بلکہ ملت اسلامیہ کے اجتماعی مقاصد کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے۔ اس لئے اس سے اشتراکِ عمل اور معاونت ایک ملی خدمت ہے۔

۱۲ خوش معاملگی کی استواری کی بنیاد یہ ہے کہ فریقین ہر وقت خدا کو اپنے درمیان رکھیں۔ واللہ مستعان

(۱۳) نمونے کے پرچہ کے لئے ۳ کے ٹکٹ آنے ضروری ہیں

ناظم ادارہ طلوع اسلام دہلی

... Press Delhi